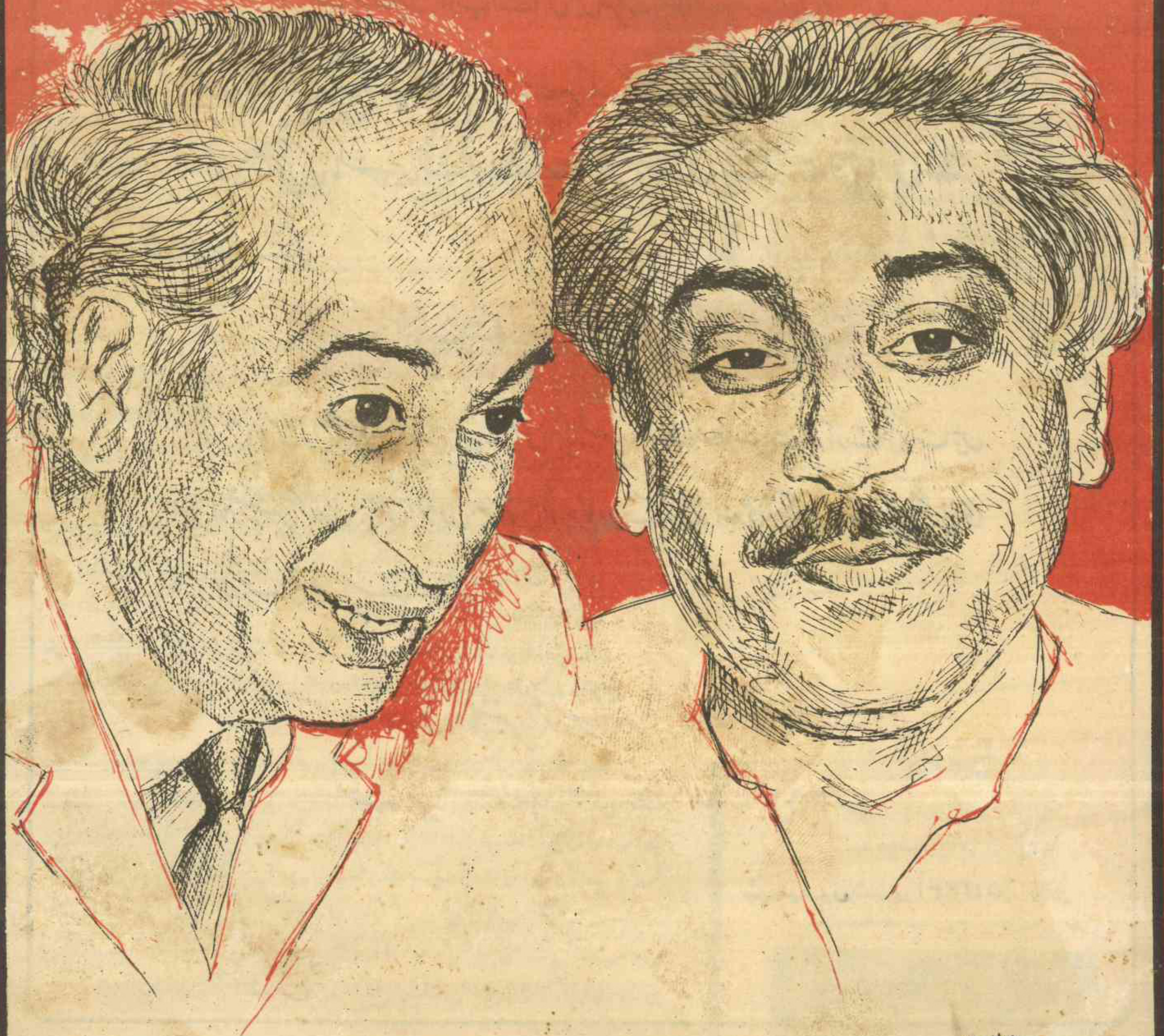
۱۷ فروری ۱۹۷۱ء

ہفت روزہ لیل و نہار

مجیبؒ بھٹوؒ ملاقات

اِن کے سمجھوتے پہ پاکستان کے روشن مستقبل کا انحصار ہے



بیکن نے ایک بار کہا تھا

کچھ کتابیں چکھنے کے لئے ہوتی ہیں، کچھ نگلنے کے لئے اور معدودے چند چبا کر کھانے اور ہضم کرنے کے لئے۔!

البتہ ہم نہایت ادب سے اس میں صرف اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ

اگر یہ رُوسی کتابیں ہیں تو آپ یقیناً ان میں سے ہر ایک کتاب کو جلدی جلدی نوالہ بنا لینا چاہیں گے۔

رُوسی کتابوں کی نمائش میں تشریف لائیے جو ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء سے ۶ فروری ۱۹۷۱ء تک جاری رہے گی۔

اس نادر موقع سے فائدہ اٹھائیے۔

رُوسی کتابوں کی اس نمائش میں سائنس، میڈیسن، فلسفہ، معاشیات اور آرٹ کی کتابیں ناول اور ٹیکنیکل کتابیں، بچوں، بڑوں، عورتوں اور مردوں کے لئے سندھی، بنگالی، اردو، انگریزی فارسی اور گجراتی میں دستیاب ہیں۔

اسٹینڈرڈ پبلشرز لمیٹڈ، میریا ہوٹل کمپاؤنڈ
مقابل ریو سینما، بونس روڈ، صدر، کراچی ۴

ٹیلیفون نمبر: ۵۱۱۲۲۱

ہفت روزہ کراچی

لیل و نہار

جلد ۲ | یکم تا ۷ فروری ۱۹۷۱ء | شمارہ ۵

فون نمبر ——— ۴۱۷۴۹۰

قیمت

مغربی پاکستان میں ——— ۶۰ پیسے

مشرقی پاکستان میں ——— ۷۵ ״

گوادر۔ پسنی میں ——— ۷۰ ״

برطانیہ میں ——— ۲ شلنگ ۶ پنس

پوسٹ بکس ۳۱۷۸ کراچی ۲۹

صراطِ مستقیم

آزادی کے بعد ہمیں اپنی حکومتوں اور اربابِ اقتدار کی سیاسی اور معاشی بداعمالیوں سے جو شکایتیں رہی ہیں وہ تو ہیں ہی، جبر و تشدد، منصب و زر کی ہوس، خود پرستی، خویش پروری، عوام دشمنی وغیرہ وغیرہ لیکن ہمارے باشعور طبقے کو سب سے زیادہ گلہ اُن مظالم کا ہے جو عوام کے جان و تن کے علاوہ ان کے دل و دماغ پر ڈھائے گئے ہیں، قومی یک جہتی کے نام پر، مُلکی سالمیت کے نام پر، تحفظِ دین کے نام پر کبھی زیر دست علاقوں سے اپنی تاریخ و تہذیب سے دست برداری کا مُطالبہ کیا گیا، کبھی لاتعداد محبانِ وطن، دشمنِ وطن ٹھہرے، کبھی ان گنت برادرانِ ملت کافر و مُرتد۔ طرح طرح کے جتن کئے گئے، بھانت بھانت کے ڈھونگ رچائے گئے تاکہ عوام کے ذہن پر کسی مُلکی، قومی، سیاسی، معاشی مسئلے کے بارے میں فکر و تدبّر کا کوئی دروازہ کھلنے نہ پائے، اور وہ آقاؤں سے اپنے دُکھ درد کا دارو طلب کرنے کے بجائے اُن کے اشاروں پر ناچتے رہیں، ان کاوشوں کا مقصد، کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، مقصد محض یہ تھا کہ موجُودہ معاشی اور سیاسی نظام پر آنچ نہ آئے اور اہلِ ثروت طبقوں کی بالادستی میں فرق نہ آنے پائے۔

حالیہ انتخابات میں مُلکی عوام نے اِن پُرانے اربابِ اقتدار اور اربابِ سیاست سے اپنی بیزاری اور برگشتگی کا اعلان تو کر دیا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ گزشتہ تئیس برس میں عوام کے دل و دماغ میں تعصب، کوتاہ نظری، جذباتیت، شخص پرستی اور بے شعور تقلید کا جو زہر گھولا گیا ہے اس کے اثرات بھی ایک روز و شب میں زائل ہو گئے ہیں، اس زہر کا تریاق تو جبھی فراہم ہو گا جب کوئی نئی سیاسی قیادت عوامی ذہن کی تربیت نئے سرے سے اپنے سر لے، اُن کے لئے بُنیادی عوامی مسائل کی اہمیت مرتب کرے اور اسی اہمیت کے مطابق ان کے لئے کوئی صحیح طریقِ فکر اور مؤثر طریقِ عمل متعین کرے، یہ صحیح طریقِ فکر اور مؤثر طریقِ عمل کیا ہے؟

صحیح طریقِ فکر یہ ہے کہ جو بھی مسئلہ درپیش ہو، انتخابات ہوں یا آئین سازی، قومی حقوق کا مسئلہ ہو یا زبان اور ذریعۂ تعلیم کا قضیہ، کوئی بین الاقوامی مہم ہو، یا کسی دُور دراز ملک میں کسی فحش اور لغو کتاب کی اشاعت، اسے دو طرح سے دیکھنا چاہیئے، اوّل یہ کہ ہمارے عوام اور محروم طبقوں کے روزمرّہ دُکھ درد، اُن کے بنیادی مطالبات اور ان کی فوری ضروریات سے اس کا کس صورت میں اور کس حد تک تعلق ہے اور اِس مسئلے کے بارے میں ایک یا دوسرا طریقِ عمل اختیار کرنے سے عوام کے بُنیادی مسائل کو حل کرنے میں کہاں تک امداد ملتی ہے۔

مؤثر طریقِ عمل یہ ہے کہ عوامی جدوجہد کی منزلِ مقصود یعنی عوامی راج کے راستے میں جو بھی قدم قدم پر کٹھن منزلیں اور مشکل مقامات آتے ہیں اُن میں سے ہر ایک کی صحیح پہچان اور ہر ایک تک پہنچنے کا کوئی جادہ مُتعیّن ہو جس سے اِدھر اُدھر خود بھٹکنا یا دوسروں کو بھٹکانا گناہ ٹھہرے۔

ہمیں احساس ہے کہ ہمارے مُلک کے موجُودہ حالات اور موجُودہ جذباتی فضا میں یہ کچھ آسان کام نہیں، اس کے لئے ہَوا کے رُخ پر چلنے کے بجائے کبھی کبھی مخالف سمت میں بھی گامزن ہونا پڑتا ہے، کم سمجھی پر مبنی عوامی جذبات کو بھڑکانے کے بجائے اِس آگ پر حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی کے چھینٹے بھی دینے پڑتے ہیں۔ اور عوام کو اُکسانے کے بجائے انہیں سمجھانے بُجھانے پر کوشش صرف کرنی پڑتی ہے، قیادت کے معنی عوام کی تقلید کے نہیں، رہنمائی کے ہیں اور قیادت کا فرض عوام کو ہدایت بہم پہنچانا ہے، اُن کی جہالت پر مہرِ تصدیق ثبت کرنا نہیں ہے۔

عوامی تحریکوں کے بل پر ہمارے ہاں جو نئی قیادت اُبھری ہے اس میں شاید ابھی اتنی خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکی کہ وُہ ہر معاملے کو اس نظر سے دیکھ سکیں لیکن انہیں یہ احساس تو یقیناً ہوگا یا ہونا چاہیئے کہ اب انہیں انتخابات کا مرحلہ درپیش نہیں ہے بلکہ وُہ ذمّہ داریاں درپیش ہیں جو انتخابات کے نتیجے میں عوام نے انہیں تفویض کی ہیں، ان ذمّہ داریوں کا تعلق قومی اسمبلی کے اندر آئین سازی سے بھی ہے اور قومی اسمبلی کے باہر عوام کو روٹی، کپڑے اور مکان کی فراہمی سے بھی، ان ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فکر و نظر کی یکسُوئی اور جہد و عمل کی راست قدمی کا تقاضا ہے کہ فروعی اور لاطائل قضیّوں میں خود اُلجھنے اور دوسروں کو اُلجھانے سے احتراز کیا جائے، وہ مقبولیت جو کسی ہنگامی ہیجان میں عوام کے کاندھوں پر سوار ہو کر حاصل کی جائے ہنگامی اور آنی جانی چیز ہے، مستقل اور پائدار قیادت وُہی ثابت ہوگی جو عوام کے صحیح مفادات کی تکمیل اور اُن کی بُنیادی مشکلات کے تدارک کے لئے فکر و عمل کی صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہے۔



احوال وطن

مجیبؔ بھٹوؔ ملاقات: ان کے سمجھوتے پر ملک کے مستقبل کا انحصار ہے

اس وقت جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مستقبل کے آئینی اور سیاسی امور پر بات چیت شروع ہو چکی ہے۔ مسٹر بھٹو کے ساتھ ان کے پندرہ رفقاء گفت و شنید میں شریک ہیں، جن میں سے بعض ارکان آئینی اور قانونی امور پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ تمام شرکائے وفد پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ارکان ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے ہمراہ، صوبائی عوامی لیگ کے صدر، کل پاکستان عوامی لیگ کے سیکریٹری اور چند دوسرے سرکردہ رہنما شامل ہیں۔

عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی یہ ملاقات، پاکستان کی آئینی اور انتظامی صورت حالات میں ایک نہایت اہم موڑ ہے۔ قبل ازیں مسٹر بھٹو کے فرستادہ، پیپلز پارٹی کے ایک رہنما مسٹر مصطفےٰ کھر، ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کر چکے ہیں۔ اس ملاقات سے، موجودہ گفت و شنید کا ایک امکان پیدا ہوا تھا، لیکن اس کے بعد جب صدر مملکت محمد یحییٰ خاں نے ڈھاکہ میں شیخ مجیب سے ملاقات کی اور لاڑکانہ میں ایک روز کے لئے مسٹر بھٹو کے مہمان ہوئے تو اسی وقت یہ اُمید پیدا ہو چلی تھی کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں میں، نہ صرف یہ کہ بات چیت جلد ہی شروع ہو گی بلکہ یہ بات اپنے ابتدائی مراحل کی حد تک کامیاب رہے گی، کیونکہ آئین سازی کے لئے ہر دو پارٹیوں کے درمیان ایک مُشترکہ بنیاد اس دوران میں قائم ہو چکی ہو گی۔

انتخابات کے فوری بعد، عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی، دونوں کی جانب سے اخبارات میں بعض ایسے بیان اور جوابی بیان شائع ہوئے تھے، جن سے عوام کے ذہنوں میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوئے۔ رجعت پسندوں نے جو شکست کے صدمے سے نڈھال تھے، ان بیانات کو اپنی کامیابی سمجھ کر جھنڈے کی طرح سر پر اٹھا لیا اور ان کے اخبارات یہ پروپیگنڈہ کرنے لگے کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی میں ہرگز مفاہمت نہیں ہو گی۔ لہٰذا اوّل تو آئین نہیں بن سکے گا اور عوامی لیگ کی اکثریت کی بنا پر اگر بن بھی گیا تو صدر یحییٰ اسے قبول نہیں کریں گے اور بالفرض یہ آئین نافذ بھی ہو گیا تو بعض صوبائی حکومتوں کے عدم تعاون کی بنا پر قابلِ عمل نہیں ہو گا۔ مطلب یہ کہ ملک میں مارشل لا بدستور نافذ رہے گا اور عوام نے انتخابات کے محاذ پر رجعت پرستوں کو عبرتناک شکست دے کر جو کامیابیاں حاصل کی ہیں، اُن سب پر پانی پھر جائے گا۔

وہ سارے عناصر، جو انتخابات کے نتائج سے خوفزدہ ہیں، یہی چاہتے ہیں کہ ملک کی دو بڑی فتح مند پارٹیوں ۔ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان، آئینی امور پر افہام و تفہیم کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے ۔ نہ آئین بنے، نہ مرکز اور صوبوں میں حکومتیں قائم ہوں، نہ بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور بڑی بڑی اجارہ داریوں کو قومی ملکیت میں لینے کا سوال اُٹھے ۔ نہ زمین کی حد ملکیت پر پابندیاں عائد ہوں اور نہ افسر شاہی کے وسیع اختیارات میں تخفیف کی نوبت آئے غرض یہ کہ مصائب و آلام کی وہ سیاہ رات کبھی ختم نہ ہو، جس میں عوام نے اپنے خون سے مشعلیں روشن کی تھیں اور اپنے نمائندوں کے اس اقرار پر اعتماد کیا تھا کہ رات ضرور جائے گی اور صبح ضرور آئے گی ۔

عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کے درمیان اس ملاقات میں نہ صرف آئین کے نکات بلکہ بعض سیاسی انتظامی اور اقتصادی معاملات بھی زیر بحث آئیں گے جہاں تک عوامی فلاح کے بنیادی نکات کا تعلق ہے، عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں کے درمیان اتفاق رائے پہلے سے موجود ہے ۔ مثلاً بنکوں اور دوسری اجارہ داریوں بھاری صنعتوں اور معدنی وسائل کو قومی ملکیت میں لینے کا سوال، سرکاری اراضی کی بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم، مزدوروں کے حالات کی اصلاح تعلیم، صحت اور فلاح عامہ کے بنیادی مطالبات کی تکمیل، شہری آزادیوں کا نفاذ، اخبارات کی آزادی، پریس ٹرسٹ کی تنسیخ وغیرہ وغیرہ۔ عوام، اپنے بنیادی مطالبات کے پیش نظر، عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی، دونوں کے رہنماؤں کی اس ملاقات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں ۔ اور ملاقات کے نتائج کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں ۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ یہ ملاقات کامیاب ہو اور ہمارا ملک، آئین اور جمہوری نظم و نسق کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو، پاکستانی عوام کی نگاہیں ۲۳ سال سے اس روزِ سعید کی منتظر ہیں جب ہمارے ملک میں آئین کے تحت ایک جمہوری اور فلاحی حکومت قائم ہو گی ۔

قیوم خاں کا صحیح جواب

عوامی جدوجہد تیز کی جائے

جو لوگ نام نہاد "نظریۂ پاکستان" اور حب الوطنی کے اس ملک میں اجارہ دار تھے ۔ اور ۲۳ سال تک اپنے سیاسی مخالفوں کو ملک کی سالمیت کا دشمن اور اس بنا پر گردن زدنی سمجھتے آئے تھے، حالیہ انتخابات میں ان کی آمرانہ سیاست کا جنازہ نکل چکا ہے ۔ حب الوطنی کے ان اجارہ داروں میں عبدالقیوم خاں بھی شامل ہیں ۔ جنہوں نے صوبہ سرحد میں اپنے دورانِ وزارت میں بابڑہ فائرنگ کے شہدا کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے سیاسی مخالفوں کی جائدادیں ضبط کیں، انہیں صوبہ بدر کیا، یا طویل مدت کے لئے جیلوں میں بند رکھا۔

یہی عبدالقیوم خاں ہیں ۔ جو مسلم لیگ کے جاہ طلب ٹولے کی پہلی صف میں شامل رہے اور مرکز یا صوبے کی وزارت میں دس



فیض احمد فیضؔ گذشتہ ہفتہ لندن میں تھے ۔ وہاں لندن کے ممتاز تاجر مسٹر محمد اقبال نے ان کی ضیافت کی ۔ تصویر میں فیض احمد فیضؔ مسٹر اقبال سے معروف گفتگو ہیں ۔

بارہ سال تک برسرِ حکومت تھے، لیکن ایوب خاں کے عرصۂ اقتدار میں معافی مانگ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ادھر ان کی آمریت ختم ہوئی، ادھر قیوم خاں اپنی جائے پناہ سے باہر نکلے اور ایک بار پھر "مضبوط مرکز" کا نعرہ لے کر اجارہ دار سرمایہ داروں اور تاجروں کا حق نمک کرنے کے لئے ملک کا دورہ کرنے لگے۔

تازہ بیان میں عبدالقیوم خاں نے نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے رہنما عبدالولی خاں کو پاکستان اور نظریۂ پاکستان کا دشمن قرار دیا ہے اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ جو لوگ "وطن دشمن" ہیں انہیں ویزے اور پاسپورٹ نہ دیئے جائیں۔

صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں ذلت آمیز شکست کھانے اور وزارت سازی کے امکان سے محروم رہ جانے کے بعد قیوم خاں کا فطری ردِّ عمل وہی ہونا چاہئے جس کا اظہار ان کے بیان میں ہوتا ہے، لیکن انہیں یاد نہیں رہا کہ پاکستانی عوام کا شعور ۲۰، ۲۲ سال کے بعد اس سطح پر پہنچ چکا ہے، جہاں قیوم خان جیسے عادی "معافی نویسوں" اور جاہ پرستوں کے بیان کا ردِّ عمل ایک خندۂ استہزا سے زیادہ نہ ہوگا۔ قیوم خاں کان کھول کر سن لیں کہ پاکستان کسی آمر، کسی حاکم، کسی فردِ واحد کے باوا کی جاگیر نہیں۔ پاکستان اس کے عوام کا ہے اور عوام کی صفوں میں اس کا ہر فرد حب الوطن ہے اور اتنا بڑا حب الوطن ہے کہ اسی کے دست و بازو کی محنت سے بستیاں اور شہر آباد ہیں۔ کھیتیاں شاداب ہیں، کھلیان میں اناج کے ڈھیر لگ رہے ہیں کارخانے مصنوعات پیدا کرتے ہیں۔ تجارت کا بازار گرم ہے۔ بجلی اور پانی کی فراوانی ہے اور قیوم خاں، جن غاصب اور مفت خورے طبقوں کے وکیل ہیں، وہ عوام کے دست و بازو کی اس دولت سے اپنے بینک اور گھر بھر رہے ہیں۔ وطن دشمن اگر کوئی ہے تو یہی طبقے اور ان کے سیاسی نوکر، قیوم خاں اور ان کے حواری ہیں۔ جنہوں نے پاکستان میں جمہوری حزبِ اختلاف کا گلا گھونٹا، حکومت پر تنقید کو وطن دشمنی کا نام دیا۔ اربابِ حکومت کی خوشامد کو "وطن دوستی" قرار دیا۔ امریکی اور برطانوی سامراج کے مفادات کی حکومت کے اندر اور اس کے باہر ترجمانی کی، بڑے بڑے سرمایہ داروں، اجارہ داروں، صنعت کاروں اور جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ کیا اور آج بھی جب کہ یہ طبقے عوامی نمائندوں کی کامیابی کے پیش نظر، اپنی گزشتہ بداعمالیوں کی جواب دہی سے خائف ہیں۔ قیوم خاں ان طبقوں کا حقِ نمک ادا کرنے کے لئے عوام کے نمائندوں پر اتہام طرازی کر رہے ہیں۔

صوبہ سرحد میں بلکہ تمام صوبوں میں قیوم خاں اور دوسرے رجعت پرستوں کی ریشہ دوانیوں اور تہمت طرازیوں کا صحیح جواب یہ ہے کہ بائیں بازو کے کارکن ان کے گروہ اور جمہوری تنظیموں کے ارکان متحد ہو کر محنت کشوں کی پیشہ ورانہ تنظیموں کو تقویت پہنچائیں اور غاصب طبقوں کے خلاف عوامی جد و جہد کو تیز کریں، اس کے بعد قیوم خاں جیسے رسوائے زمانہ سیاست داں گوشۂ گمنامی میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اتنے سمگلر کہاں سے آ گئے؟

۲۴ جنوری کو بحری کسٹم اینٹی اسمگلنگ اسکواڈ نے کراچی میں ابراہیم حیدری سے ایک ٹرک پر چھاپہ مار کر پندرہ لاکھ روپے کی چاندی برآمد کر لی جسے لانچ پر لاد کر بیرونِ ملک لے جانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ اس ٹرک کا نمبر ایل۔ ایس ۴۹۵ تھا۔ اس سلسلے میں ایک شخص کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ اس سے قبل ۱۸ جنوری کو مہاجر کیمپ کے علاقے میں ایک جیپ پر چھاپہ مار کر غیر ملکی کپڑے کے ۱۵۰ تھان برآمد کئے گئے تھے۔ ۱۳ جنوری کی ایک خبر کے مطابق کسٹم پولیس نے روہڑی چیک پوسٹ پر ایک ٹرک سے ایک لاکھ روپیہ کی مالیت کا بیڑی کا پتہ برآمد کر لیا، جسے ہندوستان سے اسمگل کیا گیا تھا۔ ۱۳ جنوری ہی کو کوٹری پولیس نے ایک اسمگلر عبدالغنی کو گرفتار کر لیا، اسکے قبضہ سے ہزاروں روپے کی مالیت کا اسمگل کیا ہوا قیمتی کپڑا اور چھالیہ برآمد کی گئی۔ ۱۲ جنوری کو کراچی میں رشید آباد کی پہاڑیوں سے ایک جیپ پر چھاپہ مار کر گیارہ من چرس برآمد کرلی گئی جسکی مالیت، لاکھ روپے بتائی جاتی ہے۔ ۴ جنوری کی رات کو بحری کسٹم نے پاکستانی سمندر سے ایک ہندوستانی لانچ پکڑی جس میں بیس ہزار روپے کی سلک یارن دوبئی سے اسمگل کر کے لائی جا رہی تھی۔

چند ہی دنوں کے اندر اسمگلنگ کی اتنی بہت سی وارداتوں کا حال سن کر محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان دنیا کے اسمگلروں کا ہیڈ کوارٹر بن گیا ہے۔ اور اس کاروبار کے پیچھے بااثر افراد سرگرم ہیں جنہیں اتنا نفع ہوتا ہے کہ لاکھوں روپے کی اشیاء پکڑے جانے کے باوجود اُن کے کاروبار پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔

ہماری معیشت پہلے ہی ایک سخت بحران سے گزر رہی ہے اسمگلنگ کی مسلسل وارداتیں معاشی بحران میں اضافے کا سبب بن رہی ہیں۔ اسمگلنگ کا مال باہر سے لایا جائے یا پاکستان سے باہر بھیجا جائے دونوں صورتوں میں ہماری معیشت کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہاں سے اسمگل ہونے والی اشیاء کے عوض اسمگلر بیرونی کرنسی حاصل کرتے ہیں اور اسے پاکستان میں اسمگل کی جانے والی اشیاء کی خریداری پر خرچ کر دیتے ہیں، اس طرح جو سامان درآمد ہوتا ہے، اس پر ایک تو محصول نہیں دینا پڑتا اور سرکاری نقصان ہوتا ہے، دوسرے درآمدی سامان کے جائز کاروباریوں کو الگ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ حال ہی میں جب اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ کراچی کے صرافہ بازار پر چھاپہ مار کر لاکھوں روپیہ کا اسمگل کیا ہوا سونا برآمد کر لیا گیا تو لاہور میں اچانک سونے کی قیمت میں فی تولہ سات روپے کا اضافہ ہو گیا تھا۔

یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ مسلسل چھاپوں اور اکّا دکّا گرفتاریوں کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر اسمگلنگ کا کاروبار کس طرح جاری ہے اور کون لوگ ہیں، جو اس کاروبار کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ عام طور پر چھاپے کے دوران میں گرفتاریاں ہوتی ہیں، اور یقیناً ملزموں سے پوچھ گچھ بھی کی جاتی ہو گی پھر اسمگلروں کے سرغنوں کا پتہ کیوں نہیں چلتا اور اس کاروبار کے پشت پناہوں کے خلاف مؤثر کارروائی کیوں نہیں کی جاتی۔

ہمارے یہاں اسمگلنگ کی ایک صورت جسے "قانونی اسمگلنگ" کہنا چاہئے عرصہ دراز سے جاری ہے۔ مثلاً بیرونِ ملک چند روزہ قیام کے سلسلے میں جانے والے اکثر لوگ غیر ملکی سامان سستے داموں ہمراہ لا کر واپسی میں چور بازار کے بھاؤ بیچ دیتے ہیں۔ معزز پیشوں کے لوگ اور نجی اور سرکاری شعبوں کے عہدیدار جنہیں سیر و سیاحت، سرکاری مصروفیات یا وفود کے ہمراہ بیرونِ ملک جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بیش قیمت غیر ملکی سامان، مثلاً کار، کولر، ایئر کنڈیشنر، فریج، ٹی وی، ریڈیو، کیمرے، ٹیپ ریکارڈ اور بیسیوں دوسری اشیاء سے لدے پھندے تشریف لاتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ "نجی استعمال" کی ان اشیاء پر کم سے کم محصول دے کر انہیں چھڑا لیں یا اس کے بغیر ہی بیچ جائیں۔ یہ سلسلہ وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ اس سے جہاں ہمارے آسودہ حال طبقوں میں راحت طلبی، عیش کوشی، بے روح نفس پرستی اور ذہنی عیاشی کے بڑھتے ہوئے رجحان کا پتہ چلتا ہے، وہیں یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسمگلنگ کا اتنا وسیع کاروبار اس وقت تک پنپ ہی نہیں سکتا، جب تک اندرونِ ملک باہر کے ارزاں مال کی اتنے بڑے پیمانے پر مانگ نہ ہو اور اس کاروبار کی وسیع پیمانے پر سرپرستی نہ کی جائے۔

قصّہ میاں کوڈی شاہ کا

ایوب کھوڑو، سیاست کے میاں کوڈی شاہ ہیں۔

اب یہ سنیئے کہ یہ کوڈی شاہ کون ہیں؟ ایک تھے افیونچی نشے کی ترنگ میں ایک روز گھر سے گڑ خریدنے نکلے، شام کا وقت، گلی محلے میں بچوں کا شور، ایک طرف لڑکے کبڈی کھیل رہے تھے، یہ بھی ان میں شامل ہو گئے۔ ذرا دیر بعد نشے نے زور باندھا، ٹھنڈی ہوا جو لگی تو کبڈی، کباڈی، کوڈی کوڈی، "کہتے ہوئے آپ ہی آپ سرپٹ نکل بھاگے" ایک جگہ سامنے دیوار دیکھی تو ٹھٹک کر اس کے سہارے کھڑے ہو گئے، اب کیفیت یہ تھی کہ گڑ کے لئے اکنّی مٹھی میں، اور یہ خود حالتِ رکوع میں، اسی عالم میں پہر رات گذر گئی گلیاں سنسان ہو گئیں، لوگ اپنے اپنے گھر میں پڑ کر سو گئے افیونچی کی بیوی بیچاری مصیبت کی ماری گھر سے میاں کی تلاش میں نکلی ایک جگہ اندھیرے میں دیوار کے ساتھ بکری بندھی ہوئی دیکھی قریب پہنچی تو میاں کو نشے میں غین پایا، جان ہی تو جل گئی، آگے بڑھ کر پیٹھ پر دو ہتھڑ رسید کیا، یہ تڑپ کر سیدھے ہوئے کہا "لو بھائی آخر پکڑے گئے، لیکن ابھی کہاں" اور کوڈی۔ کوڈی" کہتے ہوئے ناک کی سیدھ میں سرپٹ بھاگ نکلے۔

یہی حال ایوب کھوڑو صاحب کا ہے۔ قومی اسمبلی کے انتخابات سے ایک روز پہلے تک بڑی طرح گرج رہے تھے کہ ہم یوں تلوار چلائیں گے اور یوں سوشلزم کا صفایا کر دیں گے ہمارے جیتے جی سوشلزم نہیں آ سکتا سوشلسٹوں کو اس ملک سے ولیس نکالا ہم دیں گے۔ وغیرہ وغیرہ

یہی کہتے کہتے ۷ دسمبر کی تاریخ آ گئی، شام ہوتے ہوتے ایوب کھوڑو صاحب غین ہو گئے۔ پھر کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں ہیں، لیکن ۲۲ جنوری کو معلوم نہیں کس نے دو ہتھڑ رسید کیا کہ یہ صاحب جو نشے کے عالم میں ۴۵ دن سے زیر دیوار سر نیہوڑائے کھڑے تھے، تڑپ کر اٹھے اور کوڈی کوڈی کہتے ہوئے سرپٹ بھاگ نکلے۔

اب آپ یہاں کوڈی شاہ کا وہ بیان بھی پڑھ لیجئے جو کراچی کے ایک روزنامے نے شائع کیا ہے، اس میں لکھا ہے کہ کونسل مسلم لیگ کے رہنما میاں ایوب کھوڑو نے قاضی فضل اللہ کی رہائش گاہ پر ایک مقامی ایڈووکیٹ اور دوسرے طالب علم رہنما کی رہائی کی خوشی میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم پاکستان میں سوشلزم نافذ نہیں ہونے دیں گے اور اگر اس کے نفاذ کی کوشش کی گئی تو سختی سے مقابلہ کریں گے

یہ نشے میں سرپٹ بھاگنے والی بات ہے، جس طرح میاں افیونچی کو پہر رات گذرنے کے بعد بھی یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ شام کا کھیل کب کا تمام ہوا، اسی طرح ایوب کھوڑو کو بھی ۷ دسمبر کے بعد سے کسی نے بیدار نہیں کیا، بیچارے اس وقت سے حالتِ رکوع میں زیرِ لب "کوڈی کوڈی" کر رہے تھے، اب بھی ذرا آہٹ ملتی ہے تو سمجھتے ہیں "سوشلزم آ گیا اور چونک کر فراٹے بھرنے لگتے ہیں۔ دراصل یہ جاگیردارانہ اقتدار کا نشہ ہے۔ آسانی سے نہیں اُترتا۔

کھوڑو صاحب نے نشے کی ترنگ میں مزے مزے کی باتیں کی ہیں، "مثلاً" یہ بھی کہا ہے کہ اسلام پسند جماعتیں اتحاد اور یکجہتی کے فقدان کی وجہ سے ہار گئیں۔ ممکن ہے یہ بات بعض صورتوں میں درست ہو لیکن اتحاد اور یکجہتی کی زیادتی بھی کبھی کبھی نقصان دہ ہوتی ہے، خود کھوڑو صاحب کے معاملے میں یہی ہوا۔ جماعت اسلامی نے تو انہیں پہلے ہی صالحیت کی سند دے دی تھی، بعد میں پیروں اور گدی نشینوں نے بھی سارا "زورِ ایمان" ان کی حمایت پر صرف کر دیا۔ اسلام پسندوں کا اتنا زبردست "اتحاد" پاکستان بھر میں کہیں نہیں ہوا تھا۔ لیکن انجام آپ نے دیکھ لیا، کھوڑو صاحب بُری طرح ہارے۔

یہ اسلام پسندوں میں یکجہتی کے فقدان کا عذر بھی کسی نے خوب تراشا ہے حکایت ہے کہ ایک چوہے کا "بچہ" اپنی بل سے باہر پھُدک رہا تھا کہ ادھر سے ایک ہاتھی کے بچے کا گذر ہوا، چوہے کے بچے نے یہ تن و توش پہلے کبھی کاہے کو دیکھا تھا پوچھا کہ اے بھائی جانور تیری عمر کیا ہو گی ہاتھی کا "بچہ" بے پروائی سے بولا۔ یہی کل چھ مہینے چوہے کا بچہ "اداس" ہو کر بولا عمر تو میری بھی چھ ہی مہینے ہے، لیکن میں بچپن میں بیمار بہت رہا۔

تو اے بھائی اسلام پسندو! صحت تمہاری اگر اچھی بھی رہتی تو ہاتھی کے تن و توش تک تو پہنچنے سے رہے۔ دیو ہیکل اور کوہ پیکر اتحاد عوام کا اتحاد ہوتا ہے۔ دراصل اسلام پسندوں میں تفرقے کا بہانہ، الیکشن میں ناکامی کے بعد کی دریافت ہے ورنہ پہلے تو اتحاد کی یہ صورت تھی کہ ایک کفر کا فتویٰ لاتا تھا تو ۱۱۳ اُس پر بیک وقت سر ہلاتے تھے اور ڈھاکے میں پروفیسر غلام اعظم کی دم پر کسی کا پاؤں پڑ جاتا تھا تو لاہور میں نصر اللہ خاں تڑپ اُٹھتے تھے۔ لاہور کے حلقہ نمبر ۳ میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف اگر اسلام پسند متحد نہ ہو سکے تو اس میں بھٹو صاحب اور ان کے ووٹروں کا کیا قصور، اور اگر یہ متحد ہو بھی جاتے تو کیا ہوتا جنرل سرفراز کے چار سو ووٹ، اجاوید اقبال کو زائد مل جاتے، لیکن چوہے کے تن و توش میں اگر تین ماشے کا اضافہ ہو جائے تو وہ ہاتھی نہیں ہو جاتا۔

بہر حال اب یہ باتیں رفت و گذشت ہوئیں، ہم کبھی ان کا تذکرہ نہ کرتے، لیکن کھوڑو صاحب نے یاد دلایا تو کہنا پڑا کہ صاحب آپ لوگوں کا نفاق بھی خسارے کا سودا اور اتحاد بھی مضرت کا باعث، سوکھی ہوئی لکڑیاں "متحد" ہو کر زیادہ سے زیادہ ایندھن بن سکتی ہیں، شاخِ گل نہیں بن سکتیں

ہائے بیچارے معالج

انیس نے کہا تھا ؏

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں
لیکن شکست کے مضمون کو ہزار رنگ سے باندھنا

مولانا مودودی پر ختم ہے جماعت اسلامی کی ناکامی کے سلسلے میں انہوں نے ایسی ایسی تاویلات پیش کی ہیں کہ استعارے اور استدلال کا فرق ہی ختم ہو گیا، تازہ ارشاد یہ ہے کہ اس نحیف و نزار اور بیمار و ناتواں قوم کی نبض پر تو سبھی نے انگلیاں رکھیں، لیکن جماعت اسلامی نے مرض کی صحیح تشخیص کی، اب اگر مریض اپنے معالجے کے لئے کسی اور کو منتخب کرے تو اس میں بیچارے معالج کا کیا قصور!

مریض کا معاملہ یہ ہے کہ بیچارہ عطائی کے پاس بھی جاتا ہے لیکن اُس وقت جب گرہ میں دام نہ ہوں اور اچھا معالج دستیاب نہ ہو۔ لیکن معاملہ اگر مریض کے انتخاب کا ہو، جیسا کہ بقول مولانا گذشتہ دسمبر میں ہوا تو مریض کسی عطائی کے پاس ہرگز نہیں جائے گا۔ خواہ اس کی ٹوپی کتنی ہی اونچی اور ڈاڑھی کتنی ہی نیچی کیوں نہ ہو، پھر یہ بات بھی ہے کہ مریض اپنے تجربے کی بنا پر اسی معالج کا انتخاب کرے گا جس کے ہاتھوں شفایابی کی امید ہو، جو بامروت اور خلیق ہو اور نگاہ نبض پر رکھے نہ کہ مریض کی جیب پر۔

چند سال گذرے کسی شہر میں ایک شخص سر درد کی گولیاں ایک طشتے میں رکھ کر مائکروفون پہ آواز لگاتا پھرتا تھا کہ بے حساب سستی لگا دی ہیں، آواز اتنی کرخت تھی کہ دوا فروش کے شورِ بے ہنگام سے گلی گلی کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ سردرد اور اس کی دوا دونوں ساتھ ساتھ تقسیم ہوتے رہے یہاں تک پولیس کو مداخلت کرنی پڑی۔ مولانا مودودی نے جب شہر شہر جلوس نکالے اور "شوکتِ اسلام" کا ڈھول پیٹنا شروع کیا تو ہم اس وقت سمجھ گئے تھے کہ اب یہ سردرد کی گولیاں بھی تقسیم کریں گے۔ لیکن عوام ایسے عطائیوں کا پہلے بھی تجربہ رکھتے تھے، اس لئے ان کی ایک بھی پیش نہ گئی

برطانیہ میں محکمہ ڈاک کے دو لاکھ ۳۰ ہزار ملازمین نے منگل کی رات کے بارہ بجے سے ہڑتال شروع کر دی ہے۔ ڈاک یونین کے جنرل سیکرٹری نے بتایا کہ انتظامیہ نے کوئی نئی پیشکش نہیں کی جس کی وجہ سے ڈاک کے ملازمین ہڑتال پر مجبور ہیں۔ دریں اثنا ریلوے ڈرائیوروں نے بھی دھمکی دی ہے کہ اگر ایک ہفتے کے اندر ان کی اجرتوں میں ۲۵ فیصد اضافہ نہ کیا گیا تو وہ ہڑتال کر دیں گے۔ ڈاک کے ملازمین نے اجرتوں میں ۱۶ فیصد اضافہ کا مطالبہ کیا ہے جبکہ پوسٹ آفس کارپوریشن ۸ فیصد اضافے پر تیار ہے۔ ڈاک کی ہڑتال سے برطانیہ کی معیشت پر زبردست اثر پڑنے کا امکان ہے کیونکہ برطانیہ میں کاروبار کا زیادہ تر انحصار ٹیلیفون اور ٹیلیکس سروسوں پر ہے۔ ٹیلیفون پر کئے جانے والے زرمبادلہ کے سودے اس ہڑتال سے سخت متاثر ہوں گے۔

برطانیہ میں ڈاک کی ہڑتال ° بیچینی بڑھتی جائے گی

برطانیہ جس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ اس کے اقبال کا سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔ آخر کار سرمایہ دارانہ معیشت نے اس کے اقبال کے سورج کو نگل لیا۔ اب برطانیہ کی سیاسی حالت اس بوڑھے مردم خور شیر کی سی ہے جس میں شکار کرنے کی طاقت ختم ہو چکی ہے اور برطانوی معیشت پر مسلسل چوٹیں پڑ رہی ہیں۔ پچھلے سال انتخابات میں لیبر پارٹی کی شکست کا ایک بڑا سبب برطانیہ میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور برطانوی معیشت میں عدم استحکام تھا۔ برطانوی عوام نے ٹوری جیسی قدامت پرست پارٹی کو غالباً اس امید پر کامیاب کروایا کہ شاید یہ پارٹی انہیں معاشی مسائل سے نجات دلائے لیکن سرمایہ دار ملکوں کی معیشت پچھلے چند برسوں سے جس بحران میں مبتلا ہے نہ اسے ٹوری حکومت ٹال سکتی ہے نہ لیبر حکومت۔!

مسٹر ولسن کی لیبر حکومت کو نسبتاً روشن خیال حکومت سمجھا جاتا تھا خصوصاً چین سے برطانیہ کے تجارتی تعلقات کو فروغ، جنوبی افریقہ کو ہتھیار سپلائی کرنے پر پابندی اور ۱۹۷۱ء تک خلیج فارس سے برطانوی افواج کے انخلا کے فیصلوں سے یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ لیبر پارٹی ایک نسبتاً ترقی پسند کردار ادا کر رہی ہے۔ حالانکہ ان تینوں فیصلوں میں برطانیہ کے اپنے اقتصادی مفادات پوشیدہ تھے۔ مغربی ملکوں کی منڈیوں میں سخت مقابلے خصوصاً جاپان کی سستی مصنوعات کا مقابلہ برطانیہ کے لئے بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ چین سے جاپان کے کشیدہ تعلقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانیہ نے چین سے تجارتی تعلقات بڑھا کر اپنے تیار مال کی کھپت کے لئے ایک سہارا تلاش کر لیا تھا۔ جنوبی افریقہ کو ہتھیاروں کی سپلائی پر پابندی کا بھی اقتصادی پہلو زیادہ اہم تھا بہ نسبت سیاسی پہلو کے۔ جنوبی افریقہ کو ہتھیار کی سپلائی جاری رکھنے کے نتیجے میں سارے افریقی ملکوں کی مخالفت مول لینی پڑتی۔ افریقی ملکوں کی مخالفت کا مطلب افریقہ کی منڈیوں سے ہاتھ دھونا تھا۔ ہتھیار کی سپلائی سے جو روپیہ برطانیہ کو ملتا وہ افریقی منڈیوں سے ہونے والی آمدنی سے بہت کم تھا اسی اقتصادی فائدے کے پیش نظر ولسن حکومت نے جنوبی افریقہ کو ہتھیار کی سپلائی پر پابندی لگائی تھی۔

خلیج فارس اور بحر ہند سے برطانوی افواج کے انخلا کا سبب بھی برطانیہ کی بگڑتی ہوئی معیشت تھی۔ ان علاقوں میں فوج رکھنے پر جو خرچ برطانیہ کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا اس کے مقابلے میں ان علاقوں میں برطانوی افواج کو رکھنے کے "سیاسی فائدے" اپنی افادیت کھو چکے تھے۔ خلیج فارس کی بیشتر ریاستیں یکے بعد دیگرے آزاد ہو رہی تھیں اور تقریباً ہر اس تبدیلی کے ساتھ اس علاقے میں مخالف سامراج عناصر کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ جہاں تک اس علاقے میں برطانیہ کے تیل کے مفادات کا تعلق ہے برطانوی فوج کی ان علاقوں میں موجودگی ان مفادات کی حفاظت کے لئے کوئی لازمی شرط نہ تھی۔ اسلئے کہ تیل پر سامراجی ملکوں کی اجارہ داری کا مسئلہ امریکہ کی فوجی اور سیاسی طاقت کے ساتھ بندھا ہے۔

مسٹر ولسن نے جب حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس وقت بھی برطانیہ کی معاشی صورت حال کچھ ٹھیک نہیں تھی بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ولسن حکومت نے "آزاد خیالی" اور لیبر کی نمائندہ حکومت کی نقاب اوڑھ کر سوشلسٹ ملکوں خصوصاً چین سے اپنے تجارتی تعلقات بہتر بنا کر کسی حد تک برطانوی معیشت کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ ملکی پیمانے پر ولسن حکومت برطانیہ کے سرمایہ داروں کی نمائندہ تھی بین الاقوامی سطح پر اس کی سیاست امریکہ کی پیروی اور جی حضوری پر منحصر تھی۔

مسٹر ہیتھ نے برطانوی قوم سے جو نیم مبہم وعدے کئے ہیں ان میں عام لوگوں پر ٹیکسوں میں کمی قیمتوں پر کنٹرول اور اجرتوں اور تنخواہوں میں اضافے کے علاوہ خلیج فارس کے علاقوں سے برطانوی افواج کی واپسی کے فیصلے کو کالعدم کرنا، سنگاپور اور ملیشیا میں برطانوی فوجوں کو بدستور رکھنا، جنوبی افریقہ کو دوبارہ ہتھیاروں کی سپلائی شروع کرنا، رہوڈیشیا کی اسمتھ حکومت سے تعلقات استوار کرنا اور افرو ایشیائی ملکوں کے عوام کی برطانیہ میں امیگریشن واؤچرز کے ذریعہ آمد پر پابندی لگانا شامل ہیں۔ سامراجی ملکوں میں برطانیہ سب سے سینئر سامراجی ملک ہے رنگ و نسل اور برتری کا احساس اس قوم کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ مسٹر ہیتھ کی کامیابی میں مدد دینے والے ان کے صرف دو وعدے نظر آتے ہیں۔ اول مہنگائی کم کرنے اور ٹیکسوں میں کمی کر کے اجرتیں بڑھانے کا وعدہ دوسرے افرو ایشیائی ملکوں کے برطانیہ میں داخلے پر پابندی۔ برطانوی قوم مہنگائی اور برطانیہ میں روز بروز بڑھتی ہوئی افرو ایشیائی عوام کی تعداد سے بہت خائف نظر آتی ہے۔ ٹوری پارٹی کے انتہا پسند لیڈر مسٹر پاول نے تو تارکین وطن کے مسئلہ کو انتخابی مہم کی بنیاد بنا کر برطانوی عوام میں نسلی منافرت کا جنون پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

ہیتھ حکومت نے برطانوی عوام سے جو وعدے کئے تھے ان میں جہاں تک گرانی، ٹیکسوں میں کمی، اجرتوں میں اضافے سے متعلق وعدوں کا تعلق ہے پورے نہیں کئے جا سکے۔ مہنگائی اور معاشی عدم استحکام جوں کا توں باقی ہے یہی وجہ ہے کہ برطانوی عوام میں ہیتھ حکومت کے خلاف رد عمل کی ابتدا ہو رہی ہے ٹوری پارٹی نے جنوب مشرقی ایشیا اور خلیج فارس سے برطانوی فوجوں کو برقرار رکھنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس کے پیش نظر ہیتھ حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ دفاعی اخراجات میں کمی کر کے تعلیم اور سماجی بہبود پر زیادہ روپیہ خرچ کرے۔ اگر بفرض ٹیکسوں میں کچھ کمی بھی کی گئی تو اس کا زیادہ فائدہ سرمایہ دار طبقے کو ہی پہنچے گا اس لئے کہ اس کے نتیجے میں سماجی بہبود تعلیم اور مکانات کی تعمیر کے منصوبوں میں کمی کرنی پڑے گی۔ اس سے امیر طبقہ تو خوش ہوگا۔ غریب عوام پر مہنگائی کی مصیبت بدستور برقرار رہیگی۔

اس سے قبل جون ۷۰ء میں برطانوی اخبارات میں کام کرنے والے ۲۲ ہزار ورکروں نے تنخواہوں میں اضافے بونس وغیرہ کے مطالبات پر ہڑتال کی تھی جو تین دن تک جاری رہی ۱۳ جون کو یہ ہڑتال تنخواہوں بونس وغیرہ میں دس فیصد اضافے کی منظوری کے بعد ختم ہو گئی۔ اس سے صرف ایک ماہ قبل "برٹش یورو پین ایئرویز" کے گراؤنڈ انجینئرنگ کے عملے نے بھی اپنی تنخواہوں میں اضافے کے سوال پر ہڑتال کر دی تھی۔ برطانوی معیشت جس تیزی سے تباہی کی طرف جا رہی ہے اس کے پیش نظر یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ آنے والے دنوں میں برطانوی عوام میں اور بے چینی بڑھے گی خصوصاً مسٹر ہیتھ کی حکومت کے اس فیصلے سے کہ وہ بحر ہند اور خلیج فارس میں برطانوی فوجیں بدستور رکھیں گے۔ برطانوی معیشت میں مزید بحران پیدا ہونے کا امکان ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہیتھ حکومت کس طرح مسائل پر قابو پاتی ہے ---؟

اسلام آباد :- نمائندہ خصوصی

سرمایہ داروں کے دو ایلچی بمبئی کے سیٹھوں سے مشورہ کر کے واپس آگئے

کیا بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا تجربہ ناکام بنا دیا جائے گا؟

میں نوشتۂ دیوار کو بھی مٹا دوں گا، ارب پتی صنعت کار کا اعلان

اجارہ دار خاندان کا تیسرا خفیہ اجلاس عنقریب ہونے والا ہے

پاکستان کی دولت کے لیٹرے بائیس رسوائے زمانہ خاندانوں میں سے ایک خاندان کے ارکان ان دنوں اپنے کنبے کے سربراہ کے ایک قول کا اکثر حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ یہ وہی ذات شریف ہیں، جنہوں نے اپنی انتخابی مہم میں، ۸ لاکھ روپے صرف کئے تھے، اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ انہیں شکست فاش ہوئی بلکہ بنکوں کو قومی ملکیت میں لئے جانے کا "خطرہ" بھی صاف سر پر منڈلا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان بزرگوار نے ارشاد فرمایا "خدا نے اگر انسانوں کا مقدر بنایا ہے تو اس نے انسانوں کو اپنا مقدر تبدیل کرنے کی طاقت بھی عطا کی ہے۔"

ارب پتیوں کی اس مغرور برادری کے ارکان اپنے سربراہ اعلیٰ کے اس ارادے کا اکثر تذکرہ کرتے رہتے ہیں کہ میں نوشتۂ دیوار کو بھی مٹا دوں گا، چنانچہ ان کے خاندان کی دو میٹنگیں حال ہی میں ہو چکی ہیں۔ جس میں الیکشن کے بعد کی "سٹریٹیجی" پر غور و خوض کیا گیا۔ آخری میٹنگ لاہور میں ہوئی۔ اس موقع پر خاندان کے دو ارکان کو بمبئی بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ ہندوستان کے ان بڑے بڑے صنعتی، اجارہ دار گروپوں سے صلاح مشورہ کریں جو ہندوستان کے مالی اداروں پر قابض ہیں۔ پاکستانی ارب پتیوں کے یہ ایلچی ابھی چند ہی روز قبل پاکستان واپس آگئے ہیں۔ اور خاندان کے ارکان کی تیسری میٹنگ عنقریب ہونے والی ہے۔

قطع نظر اس کے کہ خاندان کی اس میٹنگ میں کون سی "سٹریٹیجی" طے ہوتی ہے، بعض اقدامات پر عمل درآمد ابھی سے شروع ہو چکا ہے۔ تاہم یہ اقدامات پنجاب کے اس سب سے دولتمند گھرانے نے ہی شروع نہیں کئے بلکہ ملک کے دوسرے مضبوط اجارہ دار خاندانوں کی طرف سے ان پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ وہ تمام خاندان جو کمرشل بینکوں کے مالک ہیں ایک نئی چال چل رہے ہیں۔ انہوں نے کوآپریٹیو بنکوں اور دوسرے مالی اداروں میں، جن کے متعلق لوگوں کو زیادہ علم نہیں ہوتا، چپ چاپ پھیلنا شروع کر دیا ہے۔ ان کا تجزیہ یہ ہے کہ صرف بڑے بڑے کمرشل بنک ہی قومیانے کی پالیسی سے متاثر ہوں گے۔ لہٰذا اس دوران میں وہ اپنا سارا سرمایہ بڑے بڑے بینکوں سے نکال کر اپنی نئی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں آسانی سے منتقل کر دیں گے۔

ایک دو نہایت کٹر قدامت پرست پارٹیوں کے سوا جب سبھی مختلف الخیال سیاسی پارٹیوں نے اپنی اپنی جماعت کے منشور میں بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا وعدہ کیا، ان ہی دنوں بنکاری کے تمام بڑے بڑے اداروں نے ذیلی شاخیں کھولنی شروع کر دی تھیں۔ بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا وعدہ، ان پارٹیوں نے ایک ایسے زمانے میں کیا تھا، جب تقریباً ساری پسماندہ دنیا میں، ان کی حکومتوں نے مالی اداروں کو عوامی ملکیت میں لینے کا فیصلہ کیا تھا، کیونکہ ان کے خیال میں سرمایہ کو سٹہ بازی اور اسکے غیر پیداواری استعمال سے محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ یہی ہے۔

بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا وعدہ

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، یہاں بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے کا وعدہ نہایت تاخیر سے کیا گیا ہے۔ یہ ملک اور اس کے عوام اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی ۴۹ فیصد ملکیت پر بائیس خاندانوں کا قبضہ ۲۳ سال سے برداشت کرتے آئے ہیں۔ اس کے مرکزی بنک کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں ان اجارہ دار خاندانوں کے نمائندے شامل ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی پالیسیوں کی تشکیل میں، یہ خاندان کتنا گہرا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے ہوں گے۔

پاکستان کا سب سے بڑا کمرشل بنک۔ نیشنل بنک آف پاکستان، اپنے اشتہاروں میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ واحد بنک ہے جس کی ملکیت عوام کے ہاتھوں میں ہے، یہ بنک بائیس سال پہلے قائم ہوا تھا۔ اسوقت اس کے قیام کا مقصد قومی معیشت کی ایک معینہ ضرورت پوری کرنا تھا، لیکن زمانہ گزرتا رہا اور معروف صنعتی و کاروباری گروپوں کی بالادستی اس بنک پر بھی قائم ہوتی گئی۔ اب یہی لوگ نیشنل بنک آف پاکستان کے ۵۷ فیصد حصص پر قابض ہیں۔ اس کے مینجنگ ڈائرکٹر کا تقرر اگرچہ مرکزی حکومت کرتی ہے لیکن یہ ضرور یاد رکھیے کہ بنک کے بارہ ڈائرکٹروں میں سے ۹ کا انتخاب اس کے حصہ دار کرتے ہیں اور یہ وہی پاکستان کے وسائل دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے اجارہ دار خاندانوں کے ارکان ہیں۔

سرمایہ چند ہاتھوں میں

اسٹیٹ بنک اور نیشنل بنک کے معاملات سے قطع نظر، یہ بات بخوبی ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ مالیاتی ادارے، خاص طور پر کمرشل بنکنگ کا موجودہ نظام، نجی اور علاقائی عدم مساوات کا ایک بہت بڑا ذریعہ بنے رہے ہیں۔ ماضی میں بڑے بڑے صنعتی منصوبوں کی ملکیت کا دائرہ وسیع کرنے کیلئے بہت سے نیم دلانہ اقدامات کئے گئے تھے تاکہ صنعتی کاروباری اور مالی مفادات ایک ہی جگہ مرکوز ہو کر نہ رہ جائیں لیکن ان میں سے ہر اقدام ناکام ہو گیا اور اس کا واحد سبب بنکوں کی ملکیت، اُن کے انتظام اور قرضوں کی منظوری کے طریق کار کا مروجہ نظام ہے۔

گزشتہ بیس سال کے عرصے میں جس نہج پر صنعت کاری ہوئی ہے، اس سے چند ہاتھوں میں دولت کے مرکوز ہونے کا رجحان بڑھتا گیا ہے۔ انہی چند افراد کی ٹولی عوامی سرمایہ پر قابض ہو گئی ہے، یہ وہ سرمایہ ہے، جسے لاکھوں غریب مرد اور عورتیں اپنے گاڑھے پسینے کی محنت سے تھوڑا تھوڑا بچاتے ہیں، اور بنکوں میں جمع کر دیتے ہیں۔ بنکوں میں جمع ہونے والا یہی سرمایہ اُن بڑی بڑی پرشکوہ صنعتی مملکتوں کی تعمیر میں کام آتا ہے، جن کے مالک محض چند خاندان ہیں۔

بائیس خاندان بینکوں کے ۸۰ فیصد سرمایے پر قابض ہیں

انہوں نے چھوٹی چھوٹی رقمیں جمع کرنے والے لاکھوں محنت کشوں کے مجموعی سرمائے سے بے اندازہ منافع کمایا ہے۔

پاکستان میں کمرشل بنکوں نے کبھی اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا کہ قومی معیشت میں کون سے شعبے ہیں، جنہیں فوری سرمایہ کی ضرورت ہے، کون سے منصوبے ہیں، جنہیں سرمائے کے معاملے میں اولیت ملنی چاہیئے یا کون سی ضروریات ہنگامی نوعیت کی ہیں۔ مثال کے طور پر جون ۱۹۶۹ء میں کمرشل بنکوں نے جس قدر قرضے منظور کئے تھے، اُن کی محض دو فیصد سے کچھ زائد مقدار زراعت کے حصّے میں آئی ہے، حالانکہ مجموعی قومی پیداوار کا ۴۵ فیصد حصّہ زراعت سے آتا ہے۔

کمرشل بنکوں کی لُوٹ

دوسری طرف صنعت کا شعبہ ہے، جو وسیع پیمانے پر مصنوعات تیار کرتا ہے اور جس پر ۲۲ لیٹرے خاندانوں کا قبضہ ہے، انہوں نے قرضوں کے مجموعی سرمائے کا ۳۸ فیصد ہتھیا رکھا ہے حالانکہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کل قومی پیداوار میں ان کا حصّہ ۱۲ فیصد سے زیادہ نہیں۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ جون ۱۹۶۹ء میں بطور مجموعی ۱۶، کروڑ کا سرمایہ قرضوں میں تقسیم ہوا اور اس میں سے ۴۴ کروڑ کی کثیر رقم محض صنعت کاروں اور تھوک کے بیوپاریوں اور خوردہ فروشوں کے حصّے میں گئی۔ اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ پاکستان میں صنعتی اور تجارتی سرمایہ ایک دوسرے کے شعبے میں بہت بڑے پیمانے پر پھنسا ہوا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس سرمائے کا ایک کثیر حصّہ سٹے بازی میں کام آتا ہے جس سے بالآخر اشیائے صرف کی مہنگائی میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس معاملے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کمرشل بنکوں کے مالکوں نے پبلک سرمائے کا ایک بڑا حصّہ، جو تھوڑا تھوڑا کر کے جمع ہوتا رہتا ہے، اس طرح ہتھیا رکھا ہے کہ ادا شُدہ سرمائے کی مد میں صرف ۲۰ سے ۳۰ کروڑ جمع کئے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں قرضوں کے پہلے تحقیقاتی کمیشن نے اسی سال مارچ میں یہ اطلاع دی کہ بنکوں نے جس قدر سرمایہ بطور قرض تقسیم کیا ہے اس کا ۶۳ فیصد دس لاکھ سے اوپر والوں کے حسابات میں جمع ہے، جن کی کل تعداد محض ۲۲۲ ہے۔ کمیشن نے یہ بھی اطلاع دی کہ چھوٹے قرض خواہوں کو قرضوں کی مجموعی رقم کا محض ۶ ر ۵ فیصد ملا ہے۔ یہ وہ قرض خواہ ہیں جنہیں زیادہ سے زیادہ ۲۵ ہزار کی رقم قرض میں دی گئی ہے۔ کمیشن نے یہ بھی بتایا کہ بنکوں میں جو لوگ ۲۵ ہزار روپے سے کم رقم جمع کراتے ہیں اُن کا سرمایہ بنکوں کے سرمائے کا ۳۳ فیصد ہے۔ اور ان میں نصف تعداد ان کی ہے جن کی رقمیں سیونگ بنک اکاؤنٹ اور فکسڈ ڈیپازٹ اور دوسرے طرح کے ڈیپازٹ میں جمع ہیں۔

اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے چند ماہ قبل یہ اطلاع دی تھی کہ جس قدر سرمایہ قرضوں کی مد میں جاری کیا گیا ہے، اس کا ۸۲ فیصد حصّہ، کل بنک اکاؤنٹ کے محض تین فیصد کے یہاں مرکوز ہے۔ بنک نے یہ بھی بتایا کہ کل قرضوں کا ۷۰ فیصد سرمایہ صرف تین شہری علاقوں میں اکٹھا ہو گیا ہے، یعنی ڈھاکہ، کراچی اور لاہور۔ اسٹیٹ بنک نے یہ بھی اطلاع دی کہ جون ۱۹۶۹ء تک ۲۵ ہزار روپے تک کی رقم جمع کرانے والوں نے کل ۶۰۹ کروڑ کی رقم جمع کرائی۔ یہ رقم اس وقت کھاتے داروں کی مجموعی رقم کا ۶۰ فیصد تھی۔ مجموعی رقم ۱۰۱۹ کروڑ تھی۔ ایک کروڑ یا اس سے زائد رقم کے کھاتے داروں کا سرمایہ مجموعی رقم کا محض ۵ ر ۶ فیصد تھا، لیکن وہ بھی بنک کے کُل قرضوں کا ۲۵ فیصد اُس وقت تک لے جا چکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ سے لے کر ایک کروڑ تک کے کھاتے داروں نے قرض کی مد میں تقسیم ہونے والے سرمائے کا ۴۸ فیصد حاصل کر لیا تھا۔ باقی رہے وہ کھاتے دار جن کی رقمیں ۲۵ ہزار سے کم ہیں تو انہوں نے اگرچہ مجموعی طور پر سب سے زیادہ رقم جمع کرائی، اسکے باوجود جب قرض لینے کا موقع آیا تو انہیں قرض کی مد میں جاری ہونے والے کل سرمائے کا محض ۱۶ فیصد حصّہ ملا۔

عوام کا سرمایہ، سرمایہ داروں کی میراث

قیام پاکستان کے وقت کمرشل بنکوں کی تعداد ۴ تھی۔ اضافہ ہوتے ہوتے، آج ان کی تعداد ۱۳ تک پہنچ گئی ہے۔ اور ملک بھر میں ان کی ۲۵ ہزار سے زیادہ شاخیں کھل گئی ہیں۔ اس عرصے میں، ان کے ڈیپازٹ کی رقم ۸۸ کروڑ سے بڑھ کر جون ۱۹۶۹ء کے وسط میں ایک ہزار کروڑ تک جا پہنچی ہے، ایک سال قبل منصوبہ بندی کمیشن کے چیف اکنامسٹ نے علانیہ کہا تھا کہ ۲۲ خاندان بنکوں کے ۸۰ فیصد سرمائے اور انشورنس کی مجموعی رقم کے ۷۹ فیصد حصّے پر قابض ہیں، گزشتہ ۲ سال کے اندر صُورتِ حال اور بھی بدتر ہو چکی ہے۔ گزشتہ سال بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کے ۷۵ فیصد حصص صرف پندرہ خاندانوں کی ملکیت میں جا چکے تھے۔

اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے فراہم کردہ اعداد و شمار کا تجزیہ بہت دلچسپ ہے۔ جون ۱۹۶۹ء میں چھوٹے اور درمیانے درجے کے بنکوں میں صرف ۱۰۰ کروڑ روپے ڈیپازٹ کے طور پر جمع تھے۔ اس کے برعکس ۹۰۰ کروڑ روپے پر ملک کے پانچ بڑے بنکوں کا کنٹرول تھا۔ اس سرمائے کے بھی ۷۰ فیصد حصے پر دو سب سے بڑے بنکوں کا قبضہ ہے۔ ان میں سے ایک بنک اسی خاندان کی ملکیت ہے جس نے گذشتہ دنوں اپنا ایلچی بمبئی سے بیش قیمت تجربات حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

یہاں اس مطالعہ میں بھی دلچسپی کا خاصہ مواد موجود ہے کہ کس بنک پر کون سا خاندان قابض ہے۔ درج ذیل بڑے بڑے بنک جس صنعتی گروپ کے قبضے میں ہیں، ان کے نام سامنے لکھ دیئے گئے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے

(۱) آسٹریلیشیا بنک (کالونی گروپ)
(ہوتی گروپ کا بھی اس سے تعلق ہے)

(۲) کامرس بنک (فینسی گروپ)
(محمد امین، محمد بشیر بھی اس سے متعلق ہیں)

(۳) حبیب بنک (حبیب خاندان)
(داؤد گروپ اس سے تعلق ہے)

(۴) مسلم کمرشل بنک (آدم جی گروپ)
(ولیکا اصفہانی کا بھی اس سے تعلق ہے)

(۵) یونائیٹڈ بنک (سہگل خاندان)
ڈنشا، دادا اور نشاط گروپ بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں)

ان بنکوں پر کنٹرول کے معنی کیا ہیں؟ اس امر کی وضاحت گذشتہ سال کراچی سٹاک ایکسچینج کے صدر نے کی تھی، جن پر بہر حال سوشلسٹ ہونے کا "الزام" عائد نہیں ہوتا۔ کارپوریٹ اونرشپ کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے سرکاری نوعیت کی جو تدبیریں کی گئی ہیں اُن پر تبصرہ کرتے ہوئے، انہوں نے یہ انکشاف کیا تھا کہ گذشتہ سال وسط کے تین مہینوں میں، تین سرکردہ کمپنیاں پبلک سرمایہ کی شمولیت کے لئے کیپٹل مارکیٹ میں آئی تھیں۔ فی کمپنی ۵۰ کروڑ کا پبلک سرمایہ منظور ہوا۔ لیکن یہ سارا سرمایہ" بنکوں کی جانب سے اور انہی کے ذریعے" استعمال ہوا۔ کمرشل بنکوں کی ان مذموم سرگرمیوں کو حکومت اپنی مالیاتی پالیسیوں کے ذریعے اب تک کنٹرول نہیں کر سکی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے، جس کا اعتراف ایک سرکاری کمیٹی نے بھی ۱۹۶۷ء کے اوائل میں بہت نمایاں طور پر کیا تھا۔ کمیٹی کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "سٹیٹ بنک اپنی پالیسی کی رُو سے جو ہدایات بنکوں کے لئے جاری کرتا ہے۔ بنکوں کو ان کے مطابق اپنی کارکردگی جاری رکھنا قطعاً دشوار معلوم ہوتا ہے۔"

یہ وہ مراعات ہیں، جو کمرشل بنکوں کے مالکوں نے حاصل کر رکھی ہیں۔ اور جنہیں آج عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کی علانیہ پالیسیوں سے خطرہ لاحق ہے۔ بمبئی میں صلاح مشورے اور ذیلی اداروں کے اجراء کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان پالیسیوں کے ردِ عمل سے بچاؤ کی صورت نکل آئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملک کے ۲۲ لٹیرے خاندانوں کو کیا اپنا چولا بدل کر عوامی بچتوں کا سرمایہ بدستور اپنے قبضے میں رکھنے کی اجازت دے دی جائے گی، یا مناسب اقدامات کئے جائیں گے تاکہ قومی معیشت کو ان کے آہنی اور خونیں پنجوں سے نجات مل جائے۔

سوشلزم، حکومت اور سرمایہ دار، ہندوستان میں (۲)

زرخیز اراضی ریٹائرڈ فوجیوں میں تقسیم ہوگئی

ڈاکٹر گیان چند

ہماری نجی شعبے کی صنعتوں نے نہ صرف یہ کہ سوشلزم کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اس کی آمد میں حتی الوسع رکاوٹیں کھڑی کیں۔ دوسری طرف ضرورت اس بات کی تھی کہ پبلک شعبے کی صنعتوں کو مختلف انداز سے منظم کیا جاتا۔ ان پر حکومت کا کنٹرول صحیح معنوں میں ہوتا لیکن ہماری پبلک شعبے کی صنعتوں کا انتظام بھی نجی صنعتوں کی طرح کیا گیا۔ ان میں تقریباً تمام اہم عہدوں پر ایسے لوگ قابض رہے، جنہیں پبلک شعبے کے بارے میں سرے سے کوئی علم نہیں، جنہیں یہی معلوم نہیں کہ پبلک شعبے کے صنعتی منصوبے کو کس طرح منظم کرنا چاہیئے، انکی انتظامیہ سے مزدوروں کا کیا رشتہ ہونا چاہیئے، اور یہ کہ نئے اصول اور نظم و نسق کے نئے طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔

قومی ملکیت پر افسر شاہی کا قبضہ

ہندوستان نے ۱۹۵۱ء میں سوشلزم کے نفاذ کا اعلان کیا تھا، ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اور ان خطوط پر جو معیشت کے نقطۂ نظر سے بنیادی نوعیت کے تھے، پبلک شعبے کی صنعتیں شروع کی گئیں۔ اس کے باوجود، ان صنعتوں نے، اپنی تنظیم، اپنے نظم و نسق اور مزدوروں کے ساتھ اپنے تعلق کے ضمن میں، سوشلسٹ طریق انتظام کے اصولوں کو قبول نہیں کیا۔ جو لوگ ان صنعتوں کو کنٹرول کر رہے تھے، وہ بالکل سوشلسٹ نہ تھے، اور نہ کسی طرح سوشلسٹ اصولوں کے تحت کام کرنے کے پابند تھے۔ ان صنعتوں کی رہنما کمیٹیوں میں نجی شعبے کے صنعت کاروں کو بھی شامل کیا گیا تھا اور حکومت کا ان پر اس طرح کنٹرول تھا، گویا یہ بھی سرکاری محکمے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ، پبلک شعبے کی ان صنعتوں میں اگرچہ بعض نہایت اہم ترقی ہوئی، لیکن نہ تو پیداوار کے نقطۂ نظر سے، نہ انتظام کے لحاظ سے اور نہ سوشلزم کے اعتبار سے ان صنعتوں کو بہتر مفادات کے لئے استعمال کیا جاسکا۔ وہ لوگ جو ان صنعتوں میں ذمہ دار عہدوں پر قابض ہیں، وہ محض عہدیدار ہیں، جن کے لئے سوشلزم کوئی معنی نہیں رکھتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ صنعتیں، جس سماجی مقصد کے تحت قائم ہوئی تھیں، انہیں پورا نہیں کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر بینکنگ میں، ہم نے دو اہم اداروں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ ایک ریزرو بینک ہے اور دوسرا انڈین سٹیٹ بینک، دونوں کو اگرچہ قومیا یا جاچکا تھا، لیکن ان پر زیادہ تر قبضہ "نجی" تاجروں کا رہا اور جو لوگ، ان میں ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے، ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ایک سوشلسٹ ادارے کو کس طرح کا ہونا چاہیئے۔ یہ لوگ ریزرو بنک اور انڈیا سٹیٹ بنک کا نظم و نسق اس طرح چلاتے تھے، گویا یہ بھی نجی صنعت کے ادارے ہیں اور ان کی معیشت، نجی شعبے کی معیشت ہے، جن میں زبردست مقابلے کا میدان ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ نتیجہ اس صورت حال کا یہ نکلا کہ جن اداروں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا انہوں نے خاصی بڑی تعداد میں نہ تو عوام کے مفادات پورے کئے اور نہ سوشلزم کے مقاصد کی ترجمانی کی، بلکہ روایتی مفادات کی تکمیل میں یہ بھی شامل ہوگئے۔

ہمارا پبلک شعبہ، ہماری صنعتیں بالعموم، قومی آمدنی کا محض ۱۰ فیصد پیدا کرتی ہیں۔ یہ ۱۰ فیصد اگرچہ بہت اہم ہے، لیکن بہت کم ہے۔ زراعت، ابھی تک قومی آمدنی کا ۵۰ فیصد پورا کرتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ صنعتی ترقی اگرچہ بہت تیزی سے ہوئی ہے اور یہ ترقی پبلک اور نجی دونوں شعبوں میں ہوئی ہے۔ لیکن ہندوستان کی حکومت کو یاد نہیں رہا کہ اس نے سوشلزم کے نفاذ کا وعدہ کیا تھا، اور اسے ایسی تدبیریں اختیار کرنی ہوں گی کہ پبلک شعبے سے کہیں زیادہ نجی شعبے کی صنعتیں عوام کے مفادات پورے کریں اور سوشلزم کے حصول میں معاون ہوں۔

عوام کا سرمایہ، زمینداروں کی خوشحالی

ترقی زراعت میں بھی ہوئی ہے، ہماری پیداوار میں نہایت تیزی سے اضافہ ہوا ہے، لیکن زرعی آبادی کی اکثریت پر اس تمام ترقی اور اضافے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ زراعت میں ہمارے تقریباً ۸۰ فیصد کاشت کار بے زمین مزدور یا مزارعے ہیں۔ ان کاشتکاروں میں جن کی اپنی زمینیں ہیں، ۳۰ فیصد چھوٹے مالکان اراضی ہیں جن کے پاس ڈھائی ڈھائی ایکڑ سے کم اراضی ہے۔ ۳۰ فیصد چھوٹی ملکیتوں کے مالک ہیں، یعنی ان کے پاس ڈھائی ایکڑ سے بھی کم اراضی ہے اور جو بے زمین مزارعے اور چھوٹے کسان ہیں آج ان کا حال ۱۹۵۱ء کے زمانے سے بھی بدتر ہے۔

اس طرح اگرچہ ہماری صنعتوں کی ترقی، دولت مند زمینداروں اور دولت مند کسانوں کے ذریعے عمل میں آئی ہے۔ لیکن زرعی مزدوروں کی ایک بھاری اکثریت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ کیونکہ ریاست کو اس سے جو آمدنی ہوئی، اس کا بیشتر حصہ دولت مند کسانوں نے اور افسر شاہی نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر لیا۔

ہمارے یہاں ۱۰ فیصد لوگ، بالادست حیثیت کے مالک ہیں۔ اور بمشکل دس فیصد ہوں گے جنہیں زراعت کی ترقی سے فائدہ پہنچا ہے اور جنہوں نے اپنی زبردست آمدنی بے زمین زرعی مزدوروں اور چھوٹے کسانوں کے مزید استحصال کی خاطر استعمال کی ہے۔ یہ ۱۰ فیصد لوگ ۵۰ فیصد اراضی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اور ۲۵ فیصد لوگ ۷۵ فیصد کو کنٹرول کرتے ہیں، اس کے برعکس زرعی مزدوروں کی ۸۰ فیصد تعداد صرف ۲۰ فیصد کی حقدار ہے۔ یہ ہمارے ملک کے عام حالات کی تصویر ہے۔ تین چوتھائی اراضی، ایک چوتھائی اقلیت کے قبضے میں ہے۔ نصف اراضی پر ۱۰ فیصد کا قبضہ ہے۔ شاید ۲۰ سے ۴۰ فیصد اراضی ۲ فیصد کے تصرف میں ہے۔ اور ہماری زرعی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ دردناک افلاس اور شدید مشقت میں مبتلا ہے اور جو قوانین ان کے لئے بنائے گئے ہیں، ان سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا، کیونکہ یہ لوگ منظم نہیں ہیں اور نوکر شاہی، یعنی ساری انتظامیہ دولت مند زمینداروں کی خدمت میں ہے۔

ریاست کا سرمایہ ذیلی تعمیرات میں صرف کیا جارہا ہے۔ سڑکیں، نہریں اور دوسری چیزوں میں کام آرہا ہے۔ گذشتہ پندرہ سال میں ریاست نے دس ہزار کروڑ روپے کا سرمایہ زراعت میں لگایا ہے، آبپاشی اور مواصلات کی رقم اس میں شمار نہیں کی گئی ہے۔ ناجائز ذرائع کی کثیر دولت، جو ناجائز طریقوں سے حاصل ہوتی ہے زرعی اداروں کا پیٹ بھرنے کے کام آتی ہے۔ زراعت میں یہ بے تحاشا سرمائے کی ریل پیل نہیں ہوئی ہے بلکہ یہ پبلک کی رقم ہے اور اس کے وسائل ہیں جنہیں پبلک مفاد میں استعمال ہونا چاہیئے تھا، لیکن انہیں انتہائی دولت مند طبقوں کے مفاد کی نذر کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ زراعت میں سرمایہ بہت سمٹ آیا ہے۔ بلکہ اسے یوں کہنا چاہیئے کہ یہ ملک کے وسائل ہیں، جنہیں غیر قانونی طریقوں سے ایسے راستے پر ڈال دیا گیا ہے کہ لامحالہ دولت مند کسانوں اور زمینداروں کو فائدہ پہنچے۔

مثال کے طور پر یو پی میں جس کا شمار چند بڑے صوبوں میں ہوتا ہے۔ انتہائی زرخیز اراضی کے قطعات پہاڑوں کے دامن میں واقع ہیں۔ یہ قطعات سرکنڈوں کے جنگل سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ریاست کے اپنے ٹریکٹروں سے اور ریاست کی منظور کردہ امدادی رقم سے، اس سارے علاقے میں جتائی کا کام مکمل ہوا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ اراضی بے زمین مزارعوں کے درمیان تقسیم کی جاتی، اس کے قطعات فوج کے جنرلوں، ریٹائرڈ سول حاکموں، اور دوسرے اہم ریٹائرڈ شخصیتوں کے درمیان تقسیم کر دیئے گئے کہ یہاں کھیتی باڑی شروع کریں۔

یہی مثال کئی دوسرے علاقوں میں دہرائی جاتی ہے، چنانچہ حکمراں طبقوں نے اپنا قانونی اختیار، اپنا منصب اور اثر و رسوخ، ان زمینوں پر قبضہ کرنے میں استعمال کیا ہے، جن پر ان کا بالکل کوئی حق نہیں بلکہ انہوں نے اس طرح بے زمین مزارعوں کو ان کے جائز حق سے محروم کیا ہے۔

امریکہ اپنے جنگی جرائم پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے

اقبال احمد امن کے لئے پاکستان کی آواز ہیں

نمائندہ خصوصی

۱۴ جنوری کو امریکہ کے اخبارات میں ایک انتہائی سنسنی خیز خبر شائع ہوئی۔ سراغرسانی کے محکمے ایف بی آئی نے الزام لگایا کہ صدر نکسن کے مشیرِ خاص مسٹر ہنری کیسنگر اغوا ہونے والے تھے لیکن انہیں بروقت بچا لیا گیا، چھ افراد، اس "سازش" میں شریک تھے۔ جرمن نژاد، ہنری کیسنگر کو اغوا کر لینے کے بعد یہ لوگ واشنگٹن کی سرکاری عمارت کو گرم رکھنے کا سارا نظام بم مار کر تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ "مجرموں" کو گرفتار کر کے ہیرس برگ کی عدالت میں پیش کیا گیا، جہاں ان پر فردِ جرم عائد کر دی گئی ہے۔ پاکستان کے ایک نامور دانشور اقبال احمد کو ان "سازشیوں" میں شامل کیا گیا ہے۔

سرکاری اعلان میں بتایا گیا کہ اس "سازش" میں تین راہب ایک راہبہ دیگر دو افراد اور ایک پاکستانی باشندہ اقبال احمد ملوث ہیں۔ ایف۔ بی۔ آئی کے ڈائرکٹر مسٹر ایڈگر ہوور کے مطابق اس ٹیم کی قیادت پادری فلپ بیریگن کے ہاتھوں میں تھی۔ جو فی الوقت جیل میں ہیں۔ دو سال قبل انہیں جبری فوجی بھرتی کا ریکارڈ جلانے کے الزام میں تین سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ اس سازش میں ان کے ایک بھائی ڈینئل بیریگن کو ملوث قرار دیا گیا ہے۔ باقی لوگوں میں پاکستانی باشندہ اقبال احمد، راہبہ الزابیتھ میکالسٹر جوزف وینڈروتھ اور رے وینڈر نیل رینٹ اور ایک سابق راہب انتھونی اسکوبلک شامل ہیں۔

"یہ سازش" باعثِ فخر ہے

سرکاری عمارت کو دھماکے سے اڑا دینے کی سازش کسی اور نے نہیں کی بلکہ خود امریکہ کے محکمہ سراغرسانی نے یہ سازش امن پسند عوام کے خلاف کی ہے۔ جس میں ایک پاکستانی نوجوان اقبال احمد کی شمولیت نے پاکستانیوں کو چکرا دیا ہے، لیکن آزادی اور انصاف کے جذبے کو سرحدوں میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا بھر کے مظلوم عوام سے والہانہ محبت کرنے کی خواہش، دنیا کی ہر خواہش سے عظیم تر اور مقدس ہوتی ہے۔ اگر ظلم اور بے انصافی کے خلاف آواز بلند کرنا، جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں کے خلاف جدوجہد کرنا، اور دنیا بھر میں ایک پائیدار امن قائم کرنے کے لئے عملی کوشش کرنا، سازش ہے تو بلاشبہ اقبال احمد کیا، اس دھرتی کے لاکھوں کروڑوں انسان اس سازش میں ملوث ہونا اپنے لئے فخر سمجھتے ہیں۔

اسکالر اقبال احمد، امریکہ میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں، وہ عرصۂ دراز سے امن کی تحریکوں اور تیسری دنیا کی قومی آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش رہے ہیں۔ انہوں نے ایف۔ سی کالج لاہور سے گریجولیشن کیا۔ پرنسٹن یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ڈاکٹریٹ کیا۔ انقلابی جنگ کے بارے میں اُن کا مطالعہ وسیع اور گہری بصیرت کا حامل ہے۔ الجزائر، ویت نام اور کیوبا کی طویل عوامی جدوجہد کے مطالعے اور تجزیے نے انہیں یقین کی اس منزل پر پہنچا دیا کہ تیسری دنیا کے مظلوم اور مسلسل استحصال کا شکار ہونے والے عوام بالآخر ایک مکمل آزادی اور خوشحالی حاصل کر لیں گے اور دنیا کی کوئی بڑی طاقت اپنے سائنسی وسائل کے ذریعہ انہیں ایک ایسا انسانی معاشرہ قائم کرنے سے نہیں روک سکتی جس کی بنیاد، انصاف، مساوات اور اشتراکِ عمل پر ہوگی۔

اقبال احمد کون ہیں

اقبال احمد نے شمالی امریکہ میں تیسری دنیا کی قومی جدوجہد آزادی اور جنگ دشمن سرگرمیوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ انہوں نے جنگ اور فاشزم کے خلاف متعدد مضامین سپردِ قلم کئے ہیں۔ جس میں اپنے نکتہ نظر کی وضاحت کے لئے عالمانہ بحث، سائنسی اور تاریخی استدلال سے کام لیا ہے ساتھ ہی عملی تحریکوں میں حصہ لے کر انفرادی حیثیت سے جنگ اور فاشزم کی بھرپور مخالفت کی ہے۔

۱۹۶۵ء میں جب جانسن حکومت نے شمالی ویت نام پر بمباری کرنے کا فیصلہ کیا تو امریکہ میں اس فیصلے کے خلاف عوامی طوفان کھڑا ہو گیا۔ اقبال احمد نے جانسن حکومت کے اس انسان دشمن فیصلے کے خلاف ہونے والے مظاہروں میں شرکت کی۔ اسکے بعد امریکہ اور کناڈا میں جب کبھی جنگ کے خلاف کوئی ریلی یا مظاہرہ ہوا تو اس میں ایک مقرر کی حیثیت سے ان کی مانگ بڑھتی گئی۔ ریوڈینیل بیریگن سے ان کی ملاقات کارنل یونیورسٹی میں ہوئی جہاں وہ پروفیسر تھے، بیریگن، پیرس سے نکلنے والے، تیسری دنیا کے ایک ترجمان رسالہ افریقیشیا میں باقاعدہ مضامین لکھتے تھے، رسالے کے مدیر اقبال احمد اور چند دوسرے افراد تھے۔ جب بیریگن ایف بی آئی کی دھمکیوں کی وجہ سے روپوش ہو گئے تو ان کا پہلا انٹرویو افریقیشیا میں شائع ہوا۔ بعض اخباری اطلاعات کے مطابق اقبال احمد کی شادی کی تقریب کی رسم ڈینیل بیریگن نے



امن کے خلاف سامراج کی نئی سازش

اسرائیل اور امریکہ: ایک نئے معاہدے کی راہ میں" اس عنوان سے اقبال احمد صاحب کا ایک مضمون گرینویل (امریکہ) کے جریدہ "پاکستان فورم" (دسمبر ۱۹۷۰ء تا جنوری ۱۹۷۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس جریدے کے جنرل ایڈیٹر جناب فیروز احمد ہیں، جنہوں نے اس مضمون کے لئے اقبال احمد صاحب کا تعارف اشاعت کے لئے ارسال کیا ہے۔ اقبال احمد صاحب کا مضمون لیل و نہار کی آئندہ اشاعت میں ملاحظہ کیجئے۔

(ادارہ)


نیل میکلاگلن


اینتھونی سکاب لک


جوزف وینڈر وتھ

ادا کی تھی۔ اقبال احمد اور بیریگن کے تعلقات اور رابطہ ایف بی آئی سے پوشیدہ نہ تھے، چنانچہ اگست ۱۹۷۰ء کے پہلے ہفتہ میں ایف بی آئی کے ایجنٹوں نے بیریگن کی تلاش میں اقبال احمد کے مکان پر چھاپہ مارا۔ اس کے باوجود یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ اقبال احمد امن کمیٹی کے اس کیتھولک گروپ اور اس مبینہ سازش میں شریک تھے یا نہیں۔

اقبال احمد نے انقلابی اور چھاپہ مار جنگ کے موضوع پر بیشمار مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ جو تیسری دنیا کے عوام میں بیحد مقبول ہیں اور بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ جدید شمالی افریقہ میں، ریاست اور سوسائٹی

۲۔ ویت نام دستاویزات، مضامین اور رائے۔

۳۔ نومور ویت نام

۴۔ ڈیبرے اور لاطینی امریکہ کا انقلاب۔

اسکے علاوہ ان کی دو کتابیں، مغرب کی سیاسی ترقی، اور "فروم پوٹیٹو بیگ ٹو پوٹیٹو باش" (کسانوں کے انقلاب) زیر طبع ہیں۔ وہ پاکستانی "فورم" کے مدیر بھی ہیں اور امریکہ میں اپنی تمام سرگرمیوں کے باوجود اس رسالے میں برابر قلمی معاونت کرتے ہیں۔

اقبال احمد امریکہ میں رہتے ہوئے جس دلیری اور جوانمردی سے سامراجی عزائم سے نبرد آزما ہیں، وہ ان کی عملی اور فکری بلندی کی اعلیٰ مثال ہے، اقبال احمد پاکستانی اور ویتنامی عوام کے درمیان ایک رشتہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی عملی کوششوں سے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان کے ۱۲ کروڑ عوام ویت نام کے جیالے عوام کے ساتھ ہیں۔ اگر امریکہ میں انصاف نام کی کوئی چیز ہے تو نام نہاد سازش کے بلبلے جلد ہی پھوٹ جائیں گے۔

"سازش" کا مقصد کیا تھا؟

سرکاری اعلان میں بتایا گیا ہے کہ اس سازش کا مقصد جنوب مشرقی ایشیا، بالخصوص ویت نام اور کمبوڈیا میں امریکہ کی بڑھتی ہوئی جنگی کارروائیوں کو روکنا اور کسنگر کے عوض ویتنامی قیدیوں کے لئے خصوصی مراعات اور رہائی حاصل کرنا تھا

ایف بی آئی کے ڈائرکٹر نے کہا کہ امریکی باشندوں میں ویت نام میں امریکی کارروائی کے خلاف نفرت اور بیزاری تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ خصوصاً نوجوان نسل امریکی پالیسی سے انتہائی مایوس نظر آتی ہے، اسی وجہ سے وہ ایسی سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں جو بالعموم امریکی مفادات کے خلاف ہوں۔ یہ سازش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا مقصد امریکی حکومت پر دباؤ ڈال کر من مانے مطالبات منوانا تھا۔

"سازش" کا انکشاف کب اور کہاں کیا گیا

"سازش" کا انکشاف، ۲۷ نومبر کو ایف بی آئی کے ڈائرکٹر مسٹر ایڈگر ہوور نے سینٹ سب کمیٹی کے ایک اجلاس میں کیا۔ سینٹ سب کمیٹی کے سامنے ایف بی آئی کے فنڈ میں اضافہ کرنے کا معاملہ درپیش تھا۔ مسٹر ہوور نے کمیٹی کو بتایا کہ عوام میں امریکی پالیسی کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ امن پسند کمیٹیوں کی سرگرمیوں میں تشدد کا رجحان تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء آئے دن ویت نام کی جنگ کے خلاف مظاہرہ کرتے ہیں۔ جو ہر حال میں امریکی مفادات کے خلاف ہے، اس قسم کے مظاہروں اور اشتعال انگیزیوں سے نمٹنے کے لئے ایف بی آئی کو بھاری اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا موجودہ صورتحال کے پیش نظر ایف بی آئی کے فنڈ میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے۔

کمیٹی کے اجلاس میں اس مسئلے پر گرما گرم بحث ہوئی اور بالآخر ارکان نے ہوور سے مطالبہ کیا کہ وہ بیریگن بھائیوں پر الزامات ثابت کرنے کے لئے کمیٹی کو ٹھوس ثبوت مہیا کریں۔ ورنہ معافی مانگیں۔ مسٹر ہوور شاید اس صورت حال کے لئے پہلے سے تیار تھے۔ انہوں نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس سنسنی خیز "سازش" کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ چھ افراد پر مشتمل یہ امن پسند کمیٹی آئندہ چند روز میں کیا کرنے والی تھی۔ اور اس "سازش" کا اصل مقصد کیا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ مسٹر ہوور اپنے اس سنسنی خیز انکشاف کے ذریعہ سینٹ کی سب کمیٹی کو کس حد تک متاثر کر سکیں اور اپنی مرضی کے مطابق ایف بی آئی کے فنڈ میں خاطر خواہ اضافہ کرنے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں؟

امریکہ کے محکمۂ انصاف نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کہی، جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس سازش کے پس پردہ کوئی سیاسی مقصد کام کر رہا تھا، مگر مسٹر ایڈگر ہوور نے اپنے تصدیق نامے میں اس بات پر زور دینے کی کوشش کی ہے کہ اس منصوبے کا مقصد امریکی حکومت پر دباؤ ڈال کر جنوب مشرقی ایشیا میں بمباری ختم کرانا اور ویت نامی قیدیوں کو رہائی دلانا تھا۔

مسٹر ہوور کا یہ سنسنی خیز انکشاف، اور امریکی حکومت کی مصلحت آمیز خاموشی خالی از علت نہیں۔ کسی بھی مسئلہ پر امریکی حکومت کی دو عملی پالیسی، سامراجی ڈپلومیسی کا ایک آزمودہ ہتھکنڈہ ہے۔

الزام میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ امن پسند ٹیم، واشنگٹن کو گرم رکھنے والی زیر زمین سرنگوں کے نقشے حاصل کرنے کی فکر میں تھی۔ یکم اپریل کو پادری فلپ بیریگن اور پادری وینڈر وتھ چند گزرگاہوں کا سراغ لگانے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ ستمبر میں پادری وینڈر وتھ نے ایک سرکاری انجینئر سے سرنگوں کے اندرونی نظام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے گفتگو کی تھی۔

امریکی حکومت نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ پادری فلپ بیریگن جیل سے اپنی ٹیم کو پیغامات اور ہدایات بھیجا کرتا تھا۔ البتہ امریکی حکومت نے اس بات کی وضاحت نہیں کی ہے کہ کیمپ بری فیڈرل جیل سے پادری فلپ کن ذرائع سے ہدایات دیا کرتا تھا۔ واضح رہے کہ کیمپ بری فیڈرل جیل پابندیوں اور سختیوں کے اعتبار سے امریکہ کی دوسری جیلوں سے ممتاز ہے۔

اقبال احمد کا ٹی وی انٹرویو

گرفتاری کے بعد اقبال احمد کا ایک ٹی وی انٹرویو نشر کیا گیا۔ جس میں انہوں نے ایڈگر ہوور یا امریکی حکومت کے الزامات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا میں امریکہ کی جنگی اور جارحانہ کارروائیوں کو انسانیت کے منافی سمجھتے ہیں، امریکہ کو رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے جنوب مشرقی ایشیا میں جنگی کارروائی فوراً بند کر دینی چاہئے وہ اپنے اس موقف سے ذرہ بھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں مگر امن کے قیام کے لئے اس طریقہ کار پر وہ یقین نہیں رکھتے جس کا الزام امریکی حکومت نے ان پر لگایا ہے۔ انہوں نے کسنگر کو اغوا کرنے اور واشنگٹن کی سرکاری عمارت کو گرم رکھنے والے نظام کو دھماکہ سے اڑانے کے الزام کو لغو اور بے بنیاد قرار دیا۔

ایف بی آئی کے ذریعہ سازش کیوں تیار کی گئی

واشنگٹن اور نیویارک کی کشادہ سڑکوں پر مارچ کرتے ہوئے امریکی عوام نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا بھر کے عوام کی طرح وہ بھی جنوب مشرقی ایشیا میں امریکی حکومت کی عوام دشمن پالیسی اور جنگی کارروائی کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، امریکی عوام امریکی پالیسی میں بہت بڑی تبدیلی کے خواہشمند ہیں۔ وہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو۔ کے اصول پر چلنا چاہتے ہیں۔ مگر حکومت اور سرکاری پالیسی پر اثر انداز ہونے والے اجارہ دار سرمایہ دار اس قسم

امریکی حکومت نفرتوں کے سیلاب کے آگے بند باندھنے سے مجبور نظر آتی ہے

کی کسی بڑی اور انقلابی تبدیلی کے خلاف ہیں۔ انہیں مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا کے پسماندہ نیم ترقی یافتہ ملکوں کی منڈیاں درکار ہیں۔ جہاں وہ ہر سال مصنوعی جنگ کی فضا پیدا کر کے واشنگٹن اور نیویارک کی بڑی بڑی اسلحہ ساز فیکٹریوں اور کمپنیوں کے تیار کردہ اسلحہ فروخت کرتے ہیں اور کروڑوں روپے کا منافع حاصل کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ امریکہ کی اس مخصوص حکمت عملی میں امریکہ کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور اجارہ دار کمپنیوں کا ہاتھ ہے جو ایشیائی عوام کا خون چوس کر امریکی بنکوں کی دولت میں بے پناہ اضافہ کر رہی ہیں۔ امریکی سامراج اپنے مخصوص مفادات کے حصول اور تحفظ کی خاطر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام پر بے پناہ ظلم و تشدد کر رہا ہے، جس کا ردّ عمل اب بتدریج امریکی معاشرے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ دنیا بھر کے عوام کی طرح امریکی عوام بالخصوص نوجوان نسل موجودہ پالیسی کو پسند نہیں کرتی۔ اور امریکہ کی طرف سے ایشیائی عوام پر مسلط کردہ جنگ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ نوجوان نسل نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے واشنگٹن، نیویارک، کیلیفورنیا، اور شکاگو میں بڑے بڑے مظاہرے کئے، جلوس نکالے، جلسے کئے، مگر امریکی پالیسی میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ ہوئی، بلکہ بڑی بے رحمی سے ان کے جذبات کو فوجی بوٹوں اور سنگینوں سے کچل دیا گیا۔

امریکی حکومت، نئی نسل میں جنگ کے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت، ان کے باغیانہ خیالات اور روز روز کے احتجاجی مظاہروں سے سخت خوفزدہ اور پریشان ہے۔ وہ جنوب مشرقی ایشیا میں اپنے ہولناک جنگی جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے طرح طرح کے ڈرامے اسٹیج کرتی ہے، نوجوان نسل میں امریکی پالیسی کو مقبول بنانے کے لئے پروپیگنڈے پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں اس کے باوجود امریکی حکومت اپنے خلاف اٹھنے والی نفرتوں کے سیلاب کے آگے بند باندھنے میں بے بس و مجبور نظر آتی ہے۔

امریکی نوجوان پرامن ذرائع کی ناکامی کے بعد دوسرے طریقۂ کار اختیار کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ محکمۂ دفاع ایف بی آئی اور سی آئی اے امریکی پالیسی کے خلاف باغیانہ خیالات رکھنے والے نوجوانوں، گروہوں اور انجمنوں پر کڑی نظر رکھتی ہے انہیں جھوٹے اور بے بنیاد مقدموں میں پھنسایا جاتا ہے۔ ان پر گھناؤنے الزامات عائد کر کے کال کوٹھریوں میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ انہیں اس قدر جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں کہ انسانیت لرزہ بر اندام رہ جاتی ہے۔ عالمی باکسر محمد علی کا واقعہ ابھی تازہ ہے، افواج میں جبری بھرتی سے انکار کرنے پرا ے جس طرح جھوٹے مقدموں میں پھنسا کر پریشان کیا گیا وہ امریکہ کی نام نہاد جمہوری آزادی کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا میں امریکہ کی انسان کش پالیسی سے ویت نام میں لڑنے والے امریکی سپاہی بھی سخت ذہنی انتشار اور مایوسی کے شکار ہیں۔ وہ اس جنگ سے لاتعلقی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگر انہیں موقع ملتا ہے تو کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو ویتنامی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یا پھر فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں، ویتنام اور کمبوڈیا میں مقیم امریکی فوجیوں میں مایوسی اور انتشار اخلاقی برائیوں کی صورت میں جنم لے رہا ہے۔ ان میں منشیات کا استعمال تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ وہ اپنے خطوں میں اس بات کا ذکر بار بار اور انتہائی کرب کے ساتھ کرتے ہیں۔ "اپنے وطن سے ہزاروں میل دور، میں کس کے لئے جنگ لڑ رہا ہوں، میں کون ہوں اور یہاں کیوں موجود ہوں۔" اس کا جواب واشنگٹن نے انہیں آج تک نہیں دیا۔

امریکی سامراج، نئی نسل کے ذہن پر پہرہ بٹھانے کے لئے ہر ہتھکنڈہ استعمال کر رہا ہے، لیکن تمام جبر اور پابندیوں کے باوجود وہ اپنے سامنے للکارنے والی نئی نسل کو چپ کرانے میں ناکام رہا ہے، ممکن ہے کل نئی نسل کی یہ چیخ سامراج کی موت کا پیغام بن جائے، مگر فی الوقت تو امریکہ کی نئی نسل اپنی نجات کی راہیں تلاش کر رہی ہے۔

امن پسند کمیٹی کے چھ بے گناہ افراد پر امریکی حکومت کے بے بنیاد الزامات، دراصل امریکی سامراج کی جارحانہ پالیسی کا حصہ ہیں، جس کے ذریعہ وہ مایوس امریکی معاشرے کے سینے سے ابھرتی ہوئی بغاوت کی چیخ کو کچلنے اور دبانے میں مصروف ہے۔

دنیا بھر کے امن پسند اور انصاف پسند عوام کی نگاہیں اب اس بات کی منتظر ہیں کہ امریکہ کی نام نہاد جمہوریت، چھ بے گناہ انسانوں کو اپنی صفائی کا موقع کہاں تک دیتی ہے، اور کس حد تک انہیں ایسے وسائل مہیا کئے جاتے ہیں جن سے وہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکیں۔ اور اس راز پر سے پردہ ہٹا سکیں کہ چھ افراد نے امریکی حکومت کے خلاف کوئی سازش نہیں کی تھی بلکہ سازش تو امریکی سامراج نے عوام کے خلاف کی ہے۔

ایسی سازشیں پہلے بھی ہو چکی ہیں

امن پسند کمیٹی کے بیریگن بھائیوں اور دوسرے افراد نے اپنے ایک تحریری بیان میں تمام سرکاری الزامات کو غلط اور بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ٹھیک اسی طرح تیس سال قبل نازی پارٹی نے اندرون ملک اپنی جارحانہ پالیسی اور بیرون ملک اپنی فوجی مہم پسندی کو جرمن عوام میں مقبول بنانے کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے ریشتاگ کو آگ لگا دی تھی۔ امریکی حکومت کی یہ نام نہاد سازش بھی نازی طرز کا ایک خطرناک ہتھکنڈہ ہے جس کے ذریعہ امریکہ جنوب مشرقی ایشیا اور مائی لائی کے قتل عام اور اپنے گھناؤنے جنگی جرائم پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ امریکی عوام، جنوب مشرقی ایشیا میں جنگ کی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔ عوام میں فوجی مہم پسندی کے خلاف نفرت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے، چنانچہ امریکی حکومت، ایف بی آئی، اور سی آئی اے کے ذریعہ امن پسند کمیٹیوں کے خلاف بے بنیاد الزامات لگا کر امریکی عوام کا رُخ کسی دوسری جانب موڑنا چاہتی ہے۔

امریکہ کے ایک مشہور کالم نویس ٹام ویکر کا کہنا ہے کہ اگر امریکی حکومت ان افراد پر الزامات ثابت نہ کر سکی تو بڑی رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ اس رسوائی سے پہلے، اگر امریکی حکومت اپنے آپ کو الزامات ثابت کرنے کا اہل نہیں پاتی تو شرافت سے اپنے الزامات واپس لے لے

واشنگٹن پوسٹ نے اس خوف کا اظہار کیا ہے کہ یہ "سازش" دو ماہ قبل ایڈگر ہوور کے قبل از وقت اور ناعاقبت اندیشہ الزامات کو صحیح ثابت کرنے کی محض کمزور سی کوشش نہ ہو۔"

مسٹر الزابتھ نے بھی ان الزامات کی سختی سے تردید کرتے ہوئے کہا کہ امن کے قیام کے لئے ہم تشدد پر یقین نہیں رکھتے، لیکن ہم حالات کی سختیوں کا مقابلہ کریں گے۔ امن پسند کمیٹی کے افراد اسپارٹاکس کی طرح ہیں جب رومنوں نے اسپارٹاکس کے گروہ (باغی غلام) کو اپنے نرغے میں لے کر سوال کیا کہ تم میں سے اسپارٹاکس کون ہے تو سارے باغیوں نے بیک زبان کہا۔

"ہم سب اسپارٹاکس ہیں۔"

عرب، اسرائیل اور امریکہ

صورتِ حالات، حقائق کی روشنی میں

— مولانا غلام رسول مہر —

کیا امریکہ، اسرائیل کی امداد سے باز رہنے کے لئے تیار ہے؟

واشنگٹن سے ایک نامہ نگار نے ۱۲ جنوری کو مشرقِ وسطیٰ کے متعلق سرکاری اور امریکی حلقوں کے متعلق جو کیفیت پیش کی ہے، اس کے بارے میں کیا کہا جائے؟ اس کے ایک ایک حرف سے ثابت ہے کہ امریکہ ہر حالت میں اسرائیل کے مقاصد کی پیش بُرد کے لئے جان لڑا رہا ہے اور جانتا ہے کہ اگرچہ ان مقاصد کی تکمیل بظاہر ممکن نہیں تاہم وہ دوسروں پر الزام لگاتا جائے گا اور اپنے گریبان میں منہ ڈالنے پر کبھی آمادہ نہ ہوگا۔ مندرجہ صدر اطلاع کے مطابق سرکاری امریکی حلقوں کے تصورات کا سرسری خاکہ یہ ہے:

۱۔ اگر روس کی طرف سے مصالحانہ کردار کی نمائش نہ ہوئی تو مصالحت کی کوئی اُمید نہیں۔

۲۔ امریکہ کے بڑے بڑے سرکاری افسروں کی رائے اب بھی یہی ہے کہ روس مشرقِ وسطیٰ میں بڑی طاقتوں کے تقابل و تصادم کا خطرہ قبول نہ کرے گا، لیکن وہ تصفیے میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔

۳۔ رُوس کا اصل مقصد یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں کشیدگی اور تناؤ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دُنیا کے اس حصے میں اپنی حیثیت مستحکم بنا لے۔

۴۔ عرب و اسرائیل کا جھگڑا روسیوں کے لئے مشرقِ وسطیٰ میں اپنے اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع کر لینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے اور وہاں حالات کی استواری روسی مفاد کیلئے سازگار نہ ہوگی۔

۵۔ امریکہ کے نزدیک روس کی روش گزشتہ مہینوں میں حوصلہ افزا نہیں رہی۔

۶۔ امریکی افسروں کی رائے ہے کہ بالفعل بڑی طاقتوں کو ذرا پیچھے ہٹا رہنا چاہئے، ورنہ اسرائیل و عرب ایک دوسرے کے لئے ان مراعات پر کے انتظام پر آمادہ نہ ہوں گے جو گفت و شنید جاری رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔

بے سروپا باتیں

آپ ان دفعات پر بار بار نظر ڈالیں اور غور فرمائیں کہ آیا ان میں ایک بھی دفعہ ایسی ہے، جسے امریکیوں کے اوہام و آرا نے توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ بنا دینے کی کوشش نہ کی ہو؟ وہ اپنے غیر منصفانہ اعمال کا الزام رُوس پر لگا رہے ہیں۔ مثلاً روس کی طرف سے اب تک مصالحت کے خلاف کون سی حرکت ہوئی اور امریکہ نے اب تک جو کچھ کیا، کیا وہ عربوں کے قومی، ملّی، وطنی اور انسانی حقوق کے یک قلم خلاف نہ تھا؟ کیا اسرائیل کے لئے مستقل ریاست کا انتظام ان لاکھوں عربوں سے صریح دشمنی کے مترادف نہ تھا، جنہیں پُشتہا پشت کے گھروں سے باہر نکالا گیا؟ واضح رہے کہ فلسطین میں عربوں کے قیام اور بود و باش کی مدّت اس سے طویل تر ہے، جتنی اہلِ یورپ کے امریکہ میں بسنے یا اینگلز کے انگلستان میں آباد ہونے کی ہے۔ کیا انہی اسرائیلیوں نے عربوں کو ڈرا دھمکا کر اور ظلم و جور کر کے گھروں سے باہر نکال کر مہاجر نہ بنایا؟ اور وہ بائیس سال سے مہاجر چلے آئے تھے مگر کسی امریکی افسر یا صدر یا کسی اور فرد کے دل میں کوئی ٹیس نہ لگی۔ پھر کیا یہی اسرائیل نہیں، جنھوں نے مصر پر اچانک حملہ کیا۔ جب امریکہ کا صدر جانسن مصریوں اور دوسرے عربوں کو یقین دلا رہا تھا کہ پیش دستی نہ کرنا، ورنہ حالات بگڑ جائیں گے؟ پھر ۱۹۶۷ء میں جنگ بندی کے بعد اسرائیل صرف امریکہ ہی کے بل پر متصرفہ علاقے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہُوا۔ امریکہ نے زیادہ سے زیادہ اسلحہ اور روپے کا انتظام اسرائیل کے لئے کیا اور انجمن اقوام متحدہ میں اسرائیل کے خلاف ہر تحریک کی مخالفت کی۔ بہ ایں ہمہ روس کے خلاف زبان کھولتے وقت حیا کا کوئی احساس دامن گیر نہیں ہوتا۔

اسرائیل کے لئے مراعات

روس کو کسی مُلک کے ساتھ خوشگوار تعلّقات پیدا کر لینے میں دقّت کیا ہے! وہ کسی کے قومی و ملّی حقوق کا دشمن نہیں لیکن آپ بتائیں امریکہ کو مشرقِ وسطیٰ یا جنوبی و مشرقی ایشیا یا کسی دوسرے حصّے میں خدائی فوجداری کا پروانہ کہاں سے ملا؟ کس نے دیا؟ امریکہ کیوں ہر جگہ دندناتا پھرتا ہے؟ در آنحالیکہ وہ حق شناسی سے یک قلم عاری ہے کہ صرف ان کا پاسدار ہے جو امریکہ کے آلۂ کار بن سکیں اور عربوں سے امریکہ کی بدسلوکی کسی تشریح کی محتاج نہیں اور یہ بدسلوکی دُنیا کے ستّر کروڑ مسلمانوں کی انتہائی دل آزاری کا موجب ہے۔

دفعہ ۶ کی حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی طرف سے ولیم راجرس نے منصوبہ صلح کے لئے پیش کیا تھا اور جو اقوام متحدہ کی قرارداد پر مشتمل تھا۔ اس میں اسرائیل کی دلداری کے لئے بطور خود ترمیم کر لی گئی ہے اور مقصود یہ ہے کہ اسرائیل کو مراعات دلائی جائیں یعنی کچھ عرب علاقے واپس نہ کئے جائیں۔

پھر مراسلے میں فرمایا گیا ہے کہ امریکہ کے نزدیک گفت و شنید آگے بڑھنے کی چند وجوہ ہیں۔ اوّل پانچ مہینے سے جنگ بند ہے۔ دوم مشرقِ وسطیٰ کی نفسیاتی فضا بہتر ہو گئی ہے۔ سوم شاہ حسین والیٔ اُردن بحران میں کامیاب ہُوا۔

امریکہ کے دونوں کناروں پر دو بڑے سمندر ہیں ایک اوقیانوس اور دوسرا بحرالکاہل۔ اِن دونوں کا پانی لے کر اگر عربوں کے باب میں امریکہ کی غلط اندیشیوں اور حق ناشناسیوں کا داغ دھونے کی کوشش کی جائے گی تو دُھل نہ سکے گا۔

فلسطینی مجاہدوں کے ساتھ شاہ حسین کے سلوک پر امریکہ بہت خوش ہے

فلسطینی گوریلے غیر منظم اور دَرہم برہم ہو گئے۔ امریکی سمجھتے ہیں کہ شاہ (حسین) اب بہتر حیثیت میں گفت و شنید کر سکتا ہے۔ گزشتہ دو سال میں اس کے لئے ایسا وقت کبھی نہیں آیا تھا ان الفاظ سے شاہ حسین کے متعلق امریکیوں کے اطمینان و دلجمعی کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس اطمینان و دلجمعی کا باعث کیا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھی جا سکتی ہے کہ پچھلے دنوں شاہ حسین نے فلسطینی مجاہدوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا اس پر امریکی کتنے خوش ہیں۔ گویا شاہ نے امریکیوں کا مقصد یوں بوجہ احسن پورا کیا کہ آزادی کے جانباز مجاہدوں کو درہم برہم کر ڈالا۔ اس طرح اسرائیل اور امریکہ کا ایک اہم مقصد اچھے طریق پر پورا کر دیا، لیکن امریکیوں کو آگے چل کر معلوم ہوگا کہ اس پورے معاملے کی حقیقی حیثیت کیا رہی۔ یہ کام اتنا سہل نہیں، جتنا امریکیوں نے سمجھ رکھا ہے۔

امریکی نقطۂ نگاہ

آخر میں امریکیوں نے کچھ تجویزیں پیش کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ روس مصالحت کو کامیاب بنانے کے لئے کئی وسیلے اختیار کر سکتا ہے:

۱۔ مصر کے لئے فوجی امداد کے سلسلے میں توسیع نہ ہو۔

۲۔ فلسطینی مہاجروں کے متعلق اپنی روش میں لچک پیدا کرے اور سمجھ لے کہ اسرائیل کی چھوٹی سی ریاست میں لاکھوں مہاجر کھپ نہیں سکتے۔

نیز فرمایا گیا ہے کہ امریکی ماہرین کے پاس ایسی کئی تجویزیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ اسرائیل کی امداد سے باز رہا یا آئندہ باز رہنے کے لئے تیار ہے؟ وہ اسرائیل کے لئے اپنی بیشتہا پشت کی نیک نامی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگوانے اور امداد دینے سے باز نہیں رہ سکتا۔ نتیجہ خواہ کچھ ہو، امریکہ نے یقین دلا دیا ہے کہ اسرائیل کی امداد برابر جاری رہے گی۔

باقی رہے مہاجرین تو وہ کہاں جائیں؟ جو اسرائیل کو فلسطین میں لانے کے ذمہ دار ہیں جو آناً فاناً اسرائیل کی ریاست بنا کر اس بین الاقوامی فتنے کو آتش کا پرکالا بنانے پر فخر کر رہے ہیں۔ وہ بتائیں کہ کیا ان کا شوق یہود نوازی پورا کرنے کیلئے پشتوں کے آباد لوگ گھر بار چھوڑ دیں اور روئے زمین کے گرتے رہیں؟ کیا منشاء اوقیانوس کا مقصد و مدعا یہی تھا؟ کیا انجمن اقوام متحدہ اسی غرض سے بنائی گئی تھی؟ امریکہ دونوں کناروں کے دو بڑے سمندر ہیں۔ ایک اوقیانوس اور دوسرا بحرالکاہل۔ ان دونوں کا پانی لے کر اگر عربوں کے باب میں امریکہ کی غلط اندیشیوں اور حق ناشناسیوں کا داغ دھونے کی کوشش کی جائے گی تو دُھل نہ سکے گا اور اسرائیل امریکیوں کو دُنیا یا آخرت کے مہلکات سے نجات نہ دلا سکے گا۔ حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ اہلِ امریکہ کے بعض طبقات یہودیوں کی دولت سے متاثر ہو کر حق و انصاف کے خلاف عمل پیرا ہیں اور اس روش پر قائم و استوار رہنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ امن کی فضا مکدر رہے اور انجمن اقوام متحدہ نہ محض کچھ کر ہی نہ سکے بلکہ جمعیتہ اقوام کی طرح یہ امریکہ کی لایعنی اغراض کی وجہ سے برباد ہو جائے۔

تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات بے حد نازک ہو گئے ہیں۔ اسرائیل نے یارنگ کے ذریعے سے گفتگو شروع تو کر دی ہے مگر جو خاص باتیں پیش کی ہیں، جن سے امریکہ اسرائیل سے متفق ہے۔ یہ ہیں۔

۱۔ جب تک صلح نہ ہو اسرائیل کو متصرفہ علاقوں سے ہٹنا نہ چاہیئے۔

۲۔ سرحدوں کے متعلق فریقین کا اتفاق لازم ہے۔

۳۔ اسرائیلی حکومت عرب مہاجرین کو واپس نہ لے گی۔

۴۔ یروشلم (پہلے کی طرح) دو حصوں میں تقسیم نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ اس پر اسرائیل ہی قابض رہے گا۔

۵۔ باہر سے کوئی حل منوایا نہ جائے گا۔

آخری دفعہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر برطانیہ، روس اور فرانس کہیں کہ فلاں بات قبول کر لو تو امریکہ اس کی تائید نہ کرے گا اور اسرائیل کے لئے انکار میں تامل نہ ہوگا۔

ساتھ ہی وزیر خارجہ اسرائیل نے کہہ دیا ہے کہ آج اسرائیل پہلے سے بدرجہا زیادہ طاقتور ہے۔ لہٰذا صلح کی کیا امید ہو سکتی ہے پانچ مہینے سے زیادہ مدت صرف اس بنا پر ضائع ہوئی کہ اسرائیل نے ایک بے سرو پا عذر پیش کر کے گفتگوئے صلح سے انکار کر دیا۔ اب آمادگی ظاہر کی تو شرطیں ایسی پیش کیں جن پر گفتگو کا سوال خارج از بحث ہے۔ چنانچہ جمہوریہ متحدہ عرب نے اسرائیل کی تجاویز بے تامل رد کر دی ہیں۔

ممکن ہے صدر نکسن کل اہلِ امریکہ کے سامنے دعویٰ کریں کہ ہم نے اسرائیل کی امداد میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ لیکن اس سلسلے میں جو کچھ برباد ہوگا۔ اس کا اندازہ آج کون کر سکتا ہے؟ کل کا مورخ قلم اٹھائے گا تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس تباہی کے سلسلے میں، جس کا ابھی کوئی صحیح اندازہ پیش کرنا ممکن نہیں کہ حقیقی اور بنیادی ذمہ دار کو نظر انداز کر دے۔ حالات کتنے ہی ناخوشگوار ہوں اور کتنے ہی ناخوشگوار تر ہو جائیں لیکن اس بربادی کا دائرہ بہت وسیع ہوگا اور اس میں انجمن اقوام متحدہ تو بظاہر بچ سکتی ہی نہیں۔ لیکن ایسے معاملات میں ممکنات ہی کا اظہار کیا جا سکتا ہے کسی کو مجبور کرنا تو سراسر خارج از بحث ہے۔

آپ کروڑوں انسانوں کا مُنہ نہیں بند کر سکتے ــ قائدِ اعظمؒ

آپ چاہتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا گروہ چونکہ سیاسی جرائم کر رہا ہے اس لئے میں مجوزہ قانون کو مان لوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ لوگوں نے اس جنگِ عظیم کے زمانے میں دفاعِ مملکت کے تحت خود اپنے ملک میں کیا کیا؟ مجھے تعجب ہے کہ برطانوی حکومت کا نمائندہ خود اپنے ملک کی تاریخ سے ناواقف ہے اور یہ نہیں جانتا کہ چھ دن سے زیادہ عرصے تک بلا مقدمہ چلائے برطانوی رعایا میں سے کسی شخص کو حراست میں نہیں رکھا جا سکتا الّا یہ کہ وہ دشمن قوم کا فرد ہو اور معاندانہ سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ یہ درست ہے کہ ہم نے اس ملک میں آپ کو یہ اختیارات دیئے ہیں کہ قانونِ دفاعِ ہند کے تحت آپ کسی برطانوی رعایا کو مقدمہ چلائے بغیر حراست میں لے لیں لیکن انگلستان میں طریقۂ کار کیا ہے؟

۱۹۱۷ء میں ایک جرمن کو جو برطانوی شہریت اختیار کر چکا تھا اٹھارہ مہینے کے لئے بند کر دیا گیا۔ انگلستان کی مجلس وکلاء اور بعض ججوں نے بھی اسکے دفاع کے لئے چندہ کیا تاکہ مقدمہ دارالامرا میں پیش کیا جائے۔ لیکن ہماری مجلسِ مقننہ میں آپ کی اکثریت ہے اس لئے یہاں آپ حسبِ مرضی قانون بنا لیجئے۔ آپ کہتے ہیں کہ اگر یہ قانون نہ بنا تو ہنگامہ بڑھ جائے گا۔ میں کہتا ہوں ہنگامہ اسوقت انتہا کو پہنچا ہوا ہے بدقسمتی سے سرکاری حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر عوامی رائے کے سامنے جھکا گیا تو اسے حکومت کی کمزوری کی نشانی سمجھا جائے گا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ یہ کمزوری نہیں انصاف ہوگا۔ اس طرح حکومت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ آپ تیس کروڑ انسانوں کا مُنہ نہیں بند کر سکتے۔ کوئی ایک آدھ آدمی ایسی بات کہے یا کوئی چیتھڑا ایسی بات شائع کرے تو الگ بات ہے کسی ذمہ دار شخص کی زبان سے ایسی بات نہیں سنیں گے۔

میں انگلستان کی عدالت اور لارڈ شا کے فیصلے سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے آزادی اور زندگی دونوں کے مسئلے کو ایک ہی اصول کے تحت اور مساوی درجہ کا شمار کیا ہے۔ "وہ کہتے ہیں کہ عدالتی یا قانونی چارہ جوئی کے بغیر کسی شخص کو زندگی سے محروم کرنا یا زبردستی اسکی جائداد چھین لینا، ایک ایسا بیہودہ اور رسوا کن فعل ہے جس سے ساری مملکت میں خوف و ہراس کی لہر پھیل جائے گی۔ لیکن کسی شخص کو خفیہ طور پر جیل میں بند کر دینا جہاں سے کسی کو اسکی تکالیف کا علم نہ ہو سکے یا اسکو بھلا دیا جائے۔ ایسے فعل کا چونکہ عوام کو علم نہیں ہوتا اس لئے مطلق العنان حکومت کا یہ طریقۂ کار کہیں زیادہ خطرناک ہے۔"

غزلیں

رسبیعہ فخری

بھونچال وہ آیا بچ نہ سکا کوئی اونچے ایوانوں میں
ہاں لیکن جو آ بیٹھے خود محلوں سے میدانوں میں
ٹیلوں پہ کھڑے ہو کر جو کبھی موجوں کا نظارہ کرتے تھے
تنکوں کی طرح اب بہتے ہیں وہ بپھرے ہوئے طوفانوں میں
اُن کو اُکھاڑ کے پھینکے جو، وہ فصلِ گُل کی بات کرے
کیسے کیسے خار سجے ہیں باغوں میں گلدانوں میں
خون فقط دھبّہ ہی نہیں ہے بُو بھی ہے جو پھیلے گی
کب تک ہاتھ چھپائے رکھو گے رنگیں دستانوں میں
پت جھڑ میں جو پھول کھلے ہیں ایسے بے موسم بھی نہیں
برسوں ہم نے ٹپکایا ہے خون انہی ویرانوں میں
بڑھتے بڑھتے بن کے اُجالا چاروں جانب پھیل گئیں
جو کرنیں چھُپ بیٹھی تھیں کبھی آنکھوں کے روشندانوں میں
قدم قدم پہ بند بنائیں گرسا گر طوفانی ہو
کس جا پُشتے باندھیں جب طوفاں اُٹھیں انسانوں میں
لاکھوں ذرّے دل بن کر سینے میں برسوں دھڑکے ہیں
کھیل نہیں تھا جوشِ جنوں بھڑکا دینا شریانوں میں
جگہ ملے گر کہیں تو رزمی اپنا نام بھی لکھ دینا،
وقت کے سرکش دھاروں میں قدرت بھیجے اٹل فرمانوں میں

باسط عظیم

فسونِ ظلمتِ شب ہم نے توڑ ڈالا ہے
سحر قریب ہے سورج نکلنے والا ہے
ہماری راہ میں حائل نہیں ہے تیرہ شبی
ہمارے ساتھ نئی فکر کا اُجالا ہے
اب اِن میں کون ہے سقراط تم ہی پہچانو
سبھی کے ہاتھ میں اب زہر کا پیالا ہے
ہزار خاک نشینوں کو تم حقیر کہو
مگر مقام انہی کا بلند و بالا ہے،
غرور و نخوت و نفرت کا ٹمٹماتا چراغ
ہوا کے ایک ہی جھونکے سے بُجھنے والا ہے
وہ کیفیت تھی جنوں کی کہ آج مقتل میں
صدائے "ہُو" پہ لہو اپنا خود اچھالا ہے
عظیم تشنہ لبوں کو خوش آمدید کہو
خبر ہے گرم کہ میخانہ کھلنے والا ہے

مارکسسٹوں میں دائیں اور بائیں بازو کی تفریق کیسے پیدا ہوئی؟

مشرقی پاکستان میں بائیں بازو کی تحریک کے بارے میں یہ مضمون جناب عبدالحمید خان نے لکھا ہے۔ یہ مضمون قبل ازیں ڈھاکہ کے انگریزی ہفت روزہ فورم میں تین قسطوں میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ جناب مصنف اور معاصر فورم کے شکریے کے ساتھ قارئین کی خدمت میں غور و بحث کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

اختلافات کو سلجھانے سے پہلے اختلافات کو سمجھنا ضروری ہے

ادھر چند برسوں سے، مشرقی پاکستان میں بائیں بازو کے مختلف سیاسی گروہوں کے درمیان سماجی انقلاب کی حکمت عملی کے بارے میں گرما گرم بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بحث میں دو سیاسی پارٹیاں شریک ہیں، جو عوامی لیگ کے بائیں جانب ہیں۔ ان گروپوں کے درمیان جو ۱۹۶۵ء تک متحد تھے، لیکن بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک کے زبردست تفرقے نے انہیں جدا کر دیا تھا، ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ مارکسزم کے بنیادی عالمی نقطۂ نظر پر ان سب کا اتفاق ہے۔ امکانی غلط فہمی سے بچنے کے لئے اس میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں مارکسزم کی تشریح سے نہ صرف سوشل ڈیماکریسی بلکہ ٹراٹسکی ازم کو بھی خارج سمجھا جائے۔ مشرقی بنگال میں کوئی مضبوط سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اب یہ اور بات ہے کہ آج کوئی شخص عوامی لیگ کو اس زمرے میں شامل کر لے۔ اسی طرح ٹراٹسکی ازم کبھی بڑی سیاسی طاقت نہیں رہی۔ ایک ہی بڑی مارکسی تحریک کمیونسٹ پارٹی کی صورت میں موجود رہی ہے جس کا تعلق بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک سے قائم رہا ہے، اور ۱۹۶۵ء کے زمانے تک اس کی قیادت سوویٹ روس کی کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت سے اب تک، اس کے متعدد ٹکڑے ہو چکے ہیں تحریک میں بہت سے مختلف اور ممتاز مارکسی گروپ قائم ہو چکے ہیں اگرچہ جہاں تک مشرقی بنگال کی انقلابی تشکیل نو کا تعلق ہے، یہ سبھی گروپ ایک مربوط اور مبسوط سلسلۂ افکار کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

یہ بات لوگوں کو بالعموم معلوم ہے کہ مارکسسٹوں کو تنظیم اور عمل کی بمشکل کوئی آزادی میسر رہی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی ۱۹۵۴ء سے لے کر آج تک خلافِ قانون ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کو ۱۹۵۷ء میں اپنے قیام کے بعد سے اب تک ایک بڑی عوامی تنظیم کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ بائیں بازو کے عناصر نے اسی پارٹی میں شرکت کی اور اپنا سرگرم کردار ادا کیا۔ تاہم یہ دعویٰ کرنا غلط ہوگا کہ نیشنل عوامی پارٹی بجائے خود بائیں بازو کی ایک مارکسی تنظیم ہے۔ بائیں بازو کے مارکسی عنصر نے جہاں نیپ کے توسط سے عوام میں طبقاتی تنظیموں میں اور طلبا کی انجمنوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، وہیں یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان کی اپنی داخلی تنظیمیں موجود رہی ہوں گی تاکہ وہ ان تنظیموں میں اصولی مسائل اور سیاسی پالیسی پر غور و بحث جاری رکھتے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ سیاسی مبصرین کو ایسے نہایت ہی کم مباحث کا علم ہو سکا ہے۔ اس سے مارکسٹ گروپوں کی حیثیت کا تجزیہ کرنے میں سخت مشکل پیدا ہوئی ہے۔

اس مضمون میں نیپ بجائے خود موضوع بحث نہیں۔ ہمارا مقصد تو اُن مارکسی گروپوں پر توجہ مبذول کرانا ہے، جو ابھی زمانہ حال تک نیپ میں کام کرتے آئے تھے یا اب تک نیپ کے دونوں میں سے کسی ایک دھڑے میں کام کر رہے ہیں۔

مارکسسٹوں کی عظیم قربانیاں

اس مضمون کے آغاز میں ہی یہ اعتراف کر لینا ضروری ہے کہ بائیں بازو کے ان مارکسی گروپوں نے ملک کی جمہوری اور عوامی جدوجہد کے مختلف ادوار میں بے مثل جرأت کا ثبوت دیا ہے اور عدیم المثال قربانیاں پیش کی ہیں۔ اس اعتراف کے بغیر یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ زیر نظر مضمون میں ان گروپوں کے بنیادی جذبۂ اخلاص اور مقصد سے والہانہ شیفتگی کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ انہوں نے انقلابی سیاست کو نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی کا منتہائے مقصود بنایا ہے اور اس طرح متبادل کیریئر کے مواقع کو تج دیا ہے۔ بلکہ اکثر عمر قید کی صعوبتوں اور بعض اوقات موت کو بھی آگے بڑھ کر گلے لگایا ہے۔ ان لوگوں نے جس بڑے پیمانے پر قربانیاں دی ہیں ان سے دنیا کے کسی بھی حصّے کے انقلابیوں کی بہترین روایات تازہ ہو جاتی ہیں، عوام سے محبت اور بے پایاں جذبۂ وطن دوستی کے بغیر، اس طرح کی قربانیاں ظہور میں نہیں آتیں۔

اب ظاہر ہے کہ ہمارا پہلا کام خاص خاص گروپوں کی نشاندہی ہے۔ ۱۹۶۴، ۶۵ء سے قبل، اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ متبادل مارکسی گروپ بن سکتے ہیں، سچا مارکسی گروپ تو ایک ہی ہو سکتا تھا اور باقی سب مختلف ڈھب کے غدار سمجھے جاتے۔

لیکن روس اور چین میں تفرقہ پڑنے کے بعد سے اس انداز فکر کو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہا۔ متبادل مارکسی گروپوں اور پارٹیوں کی موجودگی اب بیشتر ملکوں میں عام ہے اور ان میں مشرقی بنگال بھی شامل ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں کہا جا چکا ہے بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک میں پھوٹ پڑنے کے بعد پہلی بار ۱۹۶۵ء کے لگ بھگ یہاں بھی تفرقہ پیدا ہوا۔ مشرقی بنگال کے مارکسٹ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے جنہیں ماسکو نواز اور پیکنگ نواز دھڑوں کے نام سے پہچانا گیا۔ مارکسسٹوں کی صف میں اس تفرقے کے بعد نیپ بھی دو ٹکڑے ہو گئی۔ راقم الحروف کی طرح کسی باہر کے آدمی کے لئے اس تفرقے کے اسباب معلوم کرنا لامحالہ مشکل ہوگا۔ کچھ تو اس لئے کہ طرفین کے دلائل تک بالعموم رسائی ممکن نہیں (یہ دلائل مارکسٹ گروپوں کے نہایت قلیل ارکان تک محدود ہوں گے) اور کچھ اس بنا پر کہ چھوٹے چھوٹے کثیر الزامات اور جوابی الزامات نے رفتہ رفتہ سخت موقف پیدا کر دیئے ہیں۔ جو کسی وقت اختلافات کے بیان میں محض جزوی طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا کون کس بات پہ کتنا زور دیتا ہے، اس فرق کو سمجھنا غیر ممکن ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں نہ صرف یہ کہ بعض نکات کی صراحت کرتے ہوئے پیچیدگیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بلکہ اس میں گہرے داخلی علم کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

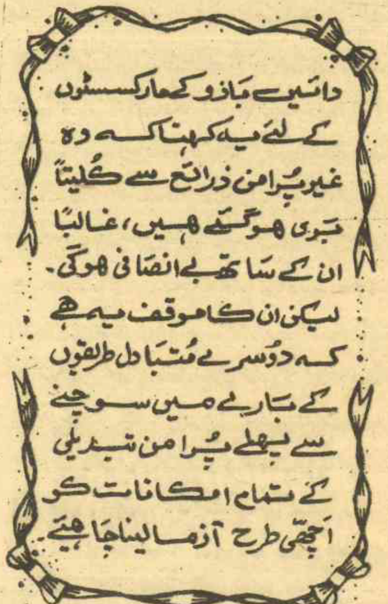
مختلف گروپوں کا استدلال

تاہم اس مضمون کے راقم نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایک ایسے تجزیے کی کوشش، اپنی جگہ بہر حال ایک اہم کام ہے۔ حالیہ برسوں میں بائیں بازو کے مارکسسٹوں میں اتنے بہت سے الگ الگ گروپ بن گئے ہیں اور بائیں بازو کی سیاست میں ان کے باہمی اختلاف اور مباحث اتنی شدت سے حاوی ہو چکے ہیں کہ بائیں بازو کے ماننے والوں کی ایک کثیر تعداد جیسے بنیادی اصولوں کا زیادہ علم نہیں یقیناً

مُحبِّ وطن بورژوازی کی حمایت کے بغیر قومی مُتحدہ محاذ کمزور ہو جائے گا

چلا کر رہ گئی ہوگی۔ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد آخر کار اس طرح کی صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بائیں بازو کے رجحان کی نشو و نما میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ خواہ اس بائیں بازو کی تعریف کتنے ہی محدود یا کتنے ہی وسیع معنوں میں کی جائے۔ اس کے علاوہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک پرانے آدمی کو مختلف گروپوں کے باہمی اختلافات کی نشاندہی اور اپنے راستے کے انتخاب میں کوئی دشواری نہ ہو۔ لیکن ایک نو وارد کو، جو سوشلزم کے وسیع تر اور پرانے محترم اصولوں سے اور اس کے سامراج دشمن اور جاگیرداری دشمن کردار سے متاثر ہو کر اس طرف آتا ہے، اپنا راستہ خود منتخب کرنے میں یقیناً سخت دشواری ہوگی، کیونکہ وہ بیک وقت بہت سے گروپوں سے دوچار ہوگا جو ایک دوسرے کے ساتھ مستقل بحث اور تنازعے میں الجھے رہتے ہیں۔

لہٰذا یہ بات ضروری نظر آتی ہے کہ مختلف گروپوں کے مبادی اصولوں کے درمیان اختلافات کی صراحت جس حد تک ممکن ہو، کر دی



جائے۔ خاص خاص گروپوں کے موقف اور ان کے درمیان اختلاف کی اہمیت کا تجزیہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کام کی تکمیل میں راقم الحروف کو اپنی کوتاہیوں کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کی معلومات ناکافی ہیں، بلکہ تمام گروپوں کے متعلق بالمشافہ معلومات حاصل کرنے کا موقع بھی اسے میسر نہیں آیا۔ اس کے باوجود جراُت سے کام لے کر یہ کوشش کر گذرنے کا ناگزیر اسباب موجود تھے۔ سب سے پہلے تو اس مسئلہ کے تجزیے کا آغاز ہونا چاہیئے اور اگر اس کام کی انجام دہی کے لئے کوئی اور شخص موجود نہیں تو راقم الحروف کی طرح دوسرے کسی شخص کے لئے مناسب ہے کہ ناکافی طور پر سہی، لیکن ابتدائے کار کر ہی دے۔ دوسری بات یہ کہ ایک نادرست اور ناتسلی بخش تجزیے سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ متعلقہ گروپ آگے بڑھ کر اپنے موقف کی صریح اور بامعنی وضاحت کریں گے

اس سلسلے میں، ان سطور کا راقم اپنے اوپر لاعلمی، نادرستی اور بے بصیرتی کا الزام بھی بخوشی قبول کر لے گا۔ البتہ اسے یہ الزام نہ دیا جائے کہ وہ بائیں بازو کو رسوا کرنے کے ارادے رکھتا ہے۔

"دایاں" بازو کیا کہتا ہے

مشرقی بنگال کے مارکسٹوں میں ابتدائی تفرقے کا بہترین تجزیہ بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک میں تفرقے کے حوالے سے کیا جا سکتا۔ یہ تفرقہ، روسی چینی کمیونسٹ پارٹیوں میں تفریق کی بنا پر پیدا ہوا۔ یہاں ایک بات ہے جس پر خاص طور سے زور دینا چاہیے۔ مارکسٹوں کے درمیان اس تفریق کا زیادہ تر سبب یہ نہ تھا کہ مشرقی بنگال کی معروضی صورتِ حال کے بارے میں ان کے تخمینے ایک دوسرے سے مختلف تھے بلکہ بیشتر بنائے اختلاف یہ سوال تھا کہ پاکستان جیسے غیر صنعتی ملکوں میں انقلاب کی پالیسی اور حکمتِ عملی کیا ہونی چاہیئے۔ اس بارے میں اصولی موقف کا اختلاف، تفرقے کا سبب بن گیا۔ پھر یقیناً یہ بات بھی ہے کہ بین الاقوامی تحریک میں اختلاف نے اس تفرقے میں اضافہ کر دیا

"دائیں" بازو کا خیال ہے کہ بورژوا جمہوری انقلاب کا حصول ایک فوری نوعیت کا کام ہے۔ اس انقلاب میں سامراجیوں کے چند حواریوں کے سوا، مشرقی پاکستان کا محب وطن بورژوازی بڑا کردار ادا کر سکتا ہے۔ دائیں" بازو کا نام (جسے اکثر و بیشتر "ناکو نواز" بھی کہا جاتا ہے، محض شناخت کی آسانی کے لئے استعمال کیا گیا ہے) یہ معیشت جس میں صنعتیں بہت کم ہیں، ابھی اتنی مضبوط اور ہمہ گیر نہیں کہ مزدوروں اور کسانوں کی زیر قیادت اسے فوری طور پر ایک سوشلسٹ نظام میں منتقل کر دیا جائے (مزدوروں اور کسانوں کی قیادت دمحنت کش طبقہ کی آمریت) کے تحت ایک نئے نظام کے فوری قیام کا نعرہ لگانا، تاکہ اس طرح سوشلزم حاصل ہو اور نجی ملکیت کے حقوق منسوخ کر دیئے جائیں، در اصل ایک ایسی بات ہے کہ اس سے غیر اجارہ دار سرمایہ دار اور چھوٹے بورژوازی بھی، سامراج اور اجارہ دار سرمایہ داروں کی صفوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے، جب تک محب وطن بورژوازی اور چھوٹے بورژوازی کی فنی مہارت اور اس کے وسائل موجود نہ ہوں گے، معیشت کی نئی تعمیر اور اس کی ترقی ممکن نہ ہوگی۔ مزدور اور کسان ضروری فنی مہارت اور وسائل پاس نہیں رکھتے۔ ان مضبوط طبقوں اور گروہوں کی شمولیت اور حمایت کے بغیر متحدہ محاذ بھی کمزور ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا استدلال سے لازمی طور پر یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ اقتدار سامراج اور جاگیر دار متقدر طبقوں سے پرامن ذرائع اختیار کر کے چھینا جا سکتا ہے۔ بورژوازی اور چھوٹے بورژوازی طبقوں کا طبقاتی مفاد، سماجی تبدیلی کے عمل میں زیادہ بے ربطی پیدا نہیں ہونے دے گا۔ لہٰذا ایک ایسے متحدہ محاذ میں ان کے اہم کردار کا تقاضہ یہ ہوگا کہ یہ محاذ، جد و جہد کے ان سب طریقوں سے اپنی بریت کا اعلان کر دے جو معاشرے میں اس حد تک الٹ پھیر پیدا کر سکتے ہیں کہ ان طبقوں کے لئے ایک حد تک نفع اندوزی اور بہتر زندگی گذارنے کی خواہش ناممکن ہو جائے۔ دائیں بازو کے ان مارکسٹوں کے لئے یہ کہنا کہ غیر پرامن ذرائع سے کلیتاً بری ہو گئے ہیں۔ غالباً ان کے ساتھ بے انصافی ہوگی، لیکن ان کا موقف یہ ہے کہ دوسرے متبادل طریقوں کے بارے میں سوچنے سے پہلے پرامن تبدیلی کے تمام امکانات کو اچھی طرح آزما لینا چاہیئے۔

بورژوا جمہوریت اور بالآخر سوشلزم کی طرف تبدیلی کا حصول اگر پرامن طریقوں سے ممکن ہے تو یہ بات بھی بعید اہم ہے کہ ایسے بہت سے سود مند مواقع موجود ہیں، جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بورژوا جمہوریت کے ادارے انتخابات اور اسمبلیوں میں نمائندگی کے طریقے موجود ہیں جہاں تدریجی سماجی تبدیلی کے لئے قوانین کے مسودے پیش کئے جا سکتے ہیں اور اس امکان کے لئے انتہائی اہم بات یہ ہے کہ سیاسی جمہوریت اور شہری آزادی، ملک میں پوری طرح قائم ہے لہٰذا یہ جمہوریت اور شہری آزادی بجائے خود، سیاسی جد و جہد کے اہم مقاصد قرار پاتے ہیں۔

بائیں بازو کا استدلال

بائیں بازو کے مارکسٹ، دائیں بازو والوں کے اس سارے موقف کے مخالف ہیں۔ اس فرق کی وضاحت کے لئے ہم غیر اجارہ دار سرمایہ دار اور چھوٹے بورژوازی کی تعریف سے ابتدا کرتے ہیں۔ اگرچہ معروضی طور پر یہ درست ہے ملک کی معیشت صنعتی دور سے قبل کی ہے اور مختلف شعبوں میں پھیلی ہوئی نہیں ہے، تاہم بائیں بازو کے مارکسٹوں کی رائے میں بورژوازی ایک طبقے کے طور پر انقلابی تبدیلی کی جد و جہد میں کوئی بڑا کردار دیا جائے کہ قیادت کا کردار ادا نہیں کر سکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقے کا مقصد محنت کش طبقے کا استحصال ہے اور اگرچہ یہ تو ممکن ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اجارہ دار اور سامراجی عناصر کے خلاف موقف اختیار کریں، لیکن وہ ہمیشہ کسی ایسے رجحان کی نمائندگی کریں گے جس سے بالآخر ان کا یہ طبقاتی وجود باقی نہیں رہے گا۔ سوشلزم کے آخری مقصد کے حصول کی خاطر مزدوروں اور کسانوں کا اتحاد اسی لئے ضروری ہے اور بورژوازی بہر حال اتنا چالاک یقیناً ہے کہ اس حقیقت کو سمجھتا ہے لہٰذا بورژوازی اس عبوری

مرحلے کا ایک لازمی اور اہم جز کبھی بھی نہیں بن سکتا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محب وطن سرمایہ دار انقلابی جدوجہد میں کسی قدر خدمت ضرور انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن صرف وہی سرمایہ دار یہ کردار ادا کر سکتے ہیں، جنھیں اس بات کا یقین ہے کہ اجارہ دار سرمایہ اور سامراج کے ہوتے ہوئے ان کا وجود باقی رہنا غیر ممکن ہے اور یہ کہ مزدوروں اور کسانوں کی متحدہ طاقت کا بالآخر کامیاب ہونا لازمی اور یقینی ہے۔ ایسے عناصر مزدوروں اور کسانوں کی امداد پر آمادہ ہوتے ہوئے اور عبوری دور میں اقتصادی تعمیر کے لئے اپنا تعاون پیش کرتے ہوئے مروجہ حالات میں بہترین کردار ادا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات ان کے علم میں ہوگی کہ انھیں حاصل ہونے والی مراعات نہایت محدود ہوں گی اور یقیناً یہ مراعات بھی بعد میں باقی نہیں رہیں گی۔ چنانچہ مزدوروں اور کسانوں کی جانب سے اس طرح کی معاونت کا خیر مقدم کرنا، بہر طور سمجھ میں آتا ہے تاہم یہ بات بالکل واضح ہے یہ کردار بہت معمولی نوعیت کا ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ محب وطن بورژوازی کوئی بڑا کردار ادا نہیں کر سکتا تو اس حقیقت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ موجودہ غیر صنعتی نیم جاگیری اور نیم نو آبادیاتی نظام سے بالآخر سوشلزم کی تعمیر تک کا عبوری مرحلہ، پرولتاریہ کے زیر قیادت ایک مسلسل تبدیلی کا مرحلہ ہوگا اور اس میں نیم سرمایہ داری نظام کا کوئی پہلو درمیان نہیں آتا۔ انقلاب کی مدد سے حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد محب وطن بورژوازی کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ سرمایہ دارانہ معیشت کو ترقی دے، کیونکہ سرمایہ داروں کی حیثیت جب مضبوط ہو جائے گی تو پھر اس ترقی کو تبدیل کرنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ اس وقت ایک دوسرا انقلاب برپا کر کے سوشلزم قائم کرنا ہوگا اور اس کے لئے مستحکم اور مضبوط سرمایہ داروں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا پڑے گا۔

حصولِ اقتدار کے طریقے

جاگیردار، اجارہ دار سرمایہ دار اور سامراجی طاقتوں کی متحد اور منقند طاقت سے اقتدار چھین لینے کا طریقہ کیا ہوگا۔ اس بارے میں بائیں بازو کے مارکسٹ، دائیں بازو والوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ اقتدار صرف متشددانہ ذرائع سے حاصل ہو سکتا ہے یعنی اس کے لئے پرولتاری طبقہ بغاوت کرے اور مسلح کارروائی اس بغاوت کی پشت پر ہو۔ ان کی دلیل کے مطابق یہ امید کرنا صریح نادانی ہوگی کہ برسراقتدار طبقے، عوام کا تعاون حاصل کرنے کے لئے پرولتاریہ کو کھلی آزادی دے دیں گے۔ یہ امید کرنا بھی نادانی ہوگی کہ برسراقتدار طبقے اپنی تباہی کے خطرے کے باوصف اور زبردست دفاعی طاقتوں سے مسلح ہوتے ہوئے بھی رائے عام کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیں گے، البشر طیکہ پرولتاری طبقے کی پارٹی اس غیر مساوی مقابلے میں کامیاب بھی ہو گئی، جس کا امکان نہیں ہوتا۔ لہٰذا مسلح جدوجہد کی تیاری انقلاب کی جانب پہلا قدم ہے۔

ایک دوسرا نکتہ جس پر مفصل بحث آئندہ کسی موقع پر ہو گی یہ ہے کہ یہاں انقلابی جدوجہد کی اصل طاقت کے لحاظ سے کسانوں کے کردار پر کہیں زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے مقابلے میں کسانوں کو زیادہ اہمیت یہاں کے مخصوص حالات کے تحت دی جاتی ہے، کیونکہ کسان محنت کش آبادی کا تقریباً ۹۰ فیصد ہیں اور مسلح انقلابی جدوجہد کی صورت میں، ان کا کردار مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، کیونکہ اس طرح کی جدوجہد صرف دیہی علاقوں میں مرکوز کی جا سکتی ہے۔

مارکسٹ اور مشرقی بنگال کی قومیت پرستی

قبل اس کے کہ ہم مارکسٹوں میں مزید متحارب گروہوں کے معاملوں پر بحث کریں، ضروری نظر آتا ہے کہ ایک اہم معاملہ میں بائیں بازو کے مارکسٹوں کے کردار پر بحث کر لیں اور یہ ہے کہ مشرقی بنگالی قومیت کا سوال۔ مشرقی بنگال کا بایاں بازو روایتی طور پر قوم پرست رہا ہے اور اسے علیحدگی پسندی کا الزام دیا گیا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ، اس موقف میں تبدیلی کے آثار رونما ہوئے، جب کہ مارکسٹوں نے مشرقی بنگال کے مطالبۂ خود مختاری کے پیچھے سامراج کی کارستانی کا عجیب و غریب نکتہ دریافت کر لیا۔ اس وقت امریکی سینیٹ کی تعلقات خارجہ کمیٹی کی روداد کے حوالے دیئے گئے، جس کے اجلاس ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ ہوئے تھے اور جن میں یہ دلیل دی گئی تھی کہ مشرقی بنگال، جس کی سیاسی حیثیت انتہائی نازک ہے صرف اس طرح مستحکم بن سکتا ہے کہ اسے خود مختار ریاست بنا کر مغربی طاقتوں کے حلقۂ اثر میں دے دیا جائے اور ہندوستان کے ساتھ اس کے خصوصی تعلقات قائم ہو جائیں۔ حقائق اگر پیش نظر ہوں تو اس سوال کا کہیں جواب نہیں ملتا کہ ایوب خان کے بظاہر نہایت مستحکم کمیونسٹ دشمن سیاسی اقتدار سے مشرقی بنگال کو الگ کر دینے کی ضرورت آخر امریکہ کو کیوں محسوس ہوئی؟ صاف ظاہر ہے کہ علیحدگی کی صورت میں سرمایہ دار اور دوسرے مراعات یافتہ طبقوں کی

ایوب خاں کے کمیونسٹ دشمن

سیاسی اقتدار سے مشرقی بنگال

کو الگ کر دینے کی ضرورت آخر

امریکہ کو کیوں محسوس ہوئی؟

منظم طاقت موجود نہ ہونے کے باعث بائیں بازو کا رجحان ابھر کر آگے آ سکتا تھا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ امریکی سامراج کسی ابھرتے ہوئے قوم پرست لیڈر پر اپنی نظریں دلچسپی سے جمائے رکھے گا۔ لیکن یہ کہنا کہ ایک مضبوط و مستحکم کمیونسٹ دشمن حکومت کے خلاف وہ قوم پرستی اور علیحدگی پسندی کی سرگرم معاونت کرے گا، انتہائی ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے، بالخصوص اس صورت میں جب ہم کسی ایسے اقدام کے لامحدود نتائج کے بارے میں سوچتے ہیں۔

قوم پرستی کے مخالفوں کا استدلال

۱۹۶۰ء اور اس کے بعد کے برسوں میں مشرقی پاکستان کے مارکسٹوں نے کن پیچ در پیچ دلائل و براہین کی بنا پر قوم پرستی کی مخالفت کا موقف اختیار کیا، اس بات کو بالکل صحیح طور پر سمجھنا غیر ممکن ہے تاہم بظاہر یہ بات نظر آتی ہے کہ ایوب خان کی خارجہ پالیسی کے متعلق انہوں نے جو نتائج اخذ کئے اس پالیسی میں اُن کا بڑا حصہ تھا۔ ایوب خان سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ بالعموم اور چین کے ساتھ خاص طور پر معمول کے تعلقات بحال کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، اگرچہ وہ مغربی سامراجیوں کے ساتھ دفاعی معاہدے ختم کرنے سے آخر وقت تک نہایت سختی کے ساتھ انکار کرتے رہے۔ بائیں بازو کے لوگوں نے اس پالیسی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور مروجہ بین الاقوامی صورت حالات میں اسے ایوب خان کا ایک مثبت عمل قرار دیا اور غالباً پورے خلوص سے یہ سمجھے ہوئے کہ بنگالی قوم پرستی کو ہوا دینے والے بھی مغربی سامراجی ہیں، بائیں بازو کے سارے مارکسٹوں نے ۱۹۶۰ء کے اوائل میں قوم پرستی کی مخالفت کو اپنا موقف بنایا جو ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے بعد تک قائم رہا۔

مشرقی بنگال کے مارکسٹ کئی اعتبار سے اسی غلطی کو دہرا رہے تھے، جو اُن کے دیگر غیر منقسم ہندوستانی پیش روؤں سے ۱۹۴۰ء کے بعد سرزد ہوئی تھی، جب ہندوستانی عوام نے ۱۹۴۲ء میں کانگریس کے زیر قیادت "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کی تو ہندوستانی مارکسٹوں نے سوویت یونین پر جرمن حملے کے بعد اپنا سابقہ اصول جس کے تحت سامراجیوں کی باہمی جنگ میں عدم شرکت کا فیصلہ کیا گیا، یکسر تبدیل کر دیا اور ایک فاشسٹ دشمن "عوامی جنگ" کی خاطر برطانوی حکمرانوں سے تعاون کا نظریہ ایجاد کر لیا۔ مارکسٹوں نے دونوں صورتوں میں قوم پرستی کی مخالفت کا موقف اختیار کیا اور ایسے اقدامات کر کے جو ان کے اندازے کے مطابق عالمی سوشلسٹ برادری کی تقویت کا موجب ہو سکتے تھے خاصی بڑی حد تک عوام کے تعاون سے محروم ہو گئے۔

(باقی آئندہ)



ظہیر اختر بیدری

امریکی سامراج ہند چینی عوام کے نرغے میں

ویت نام کی جنگ کا ماضی اور حال

جدوجہد فیصلہ کن دور میں داخل ہو گئی

ہند چینی میں ایک بار پھر امریکی سامراج کی فوجی کارروائیوں میں پچھلے چند ہفتوں سے غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے شمالی ویت نام کے فوجی ٹھکانوں پر زبردست بمباری کے ساتھ ساتھ کمبوڈیا اور لاؤس میں بھی امریکہ کی جارحانہ کارروائیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ لیکن جس طرح ماضی میں یہ علاقہ امریکی توسیع پسندوں کے لئے بلائے جان تھا۔ آج بھی وہی صورت ہے۔ امریکہ کے فوجی ذرائع نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ صرف کمبوڈیا میں پچھلے آٹھ ماہ میں ۵۱ امریکی طیارے مار گرائے گئے "چینل کی پہاڑیوں سے دشمن کا صفایا کر دو" اس فوجی مہم کے تحت امریکی افواج کمبوڈیا کی پٹھو حکومت کی مدد سے کمبوڈیا کے علاقوں پر اندھا دھند بمباری کر رہی ہے۔ ویت نام کے بعد لاؤس اور کمبوڈیا میں امریکہ کی فوجی کارروائیوں کے مقاصد پر غور کرنے سے قبل ہند چینی کی تاریخ پر مختصراً روشنی ڈالنا ضروری ہے تاکہ اس علاقے میں امریکہ کی نئی پالیسیوں کی خباثت پوری طرح سامنے آ سکے۔

ہند و چینی کی تاریخ تقریباً تین ہزار برس پرانی ہے لیکن فرانسیسی استعمار پسندوں نے ۱۸۵۸ء میں یہاں قبضہ کر کے اپنا نوآبادیاتی نظام مسلط کر دیا۔ ۱۸۵۸ء ہی سے ویت نامی عوام نے اپنی آزادی کے لئے جدوجہد شروع کر دی جو کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی۔ ۱۹۳۰ء میں ہوچی منہ کی زیر قیادت ہند چینی کی کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی۔ اس تحریک نے ہند چین کے عوام میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ڈاکٹر ہوچی منہ نے نگی این ہا شنہ کے صوبوں میں کسانوں کو منظم کر کے تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی لیکن فرانسیسی استعمار نے جاگیرداروں کی مدد سے اسے کچل دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جاپانی فسطائیوں نے فرانسیسی استعمار کو ہند چین سے بھگا کر خود اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۴۱ء میں ویت نام لیگ قائم کی گئی اور یہی تنظیم بعد میں ویت منہ کہلانے لگی۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۵ء کو ہند چین کی کمیونسٹ پارٹی نے جنگ آزادی کا باضابطہ اعلان کر کے ہنوئی پر قبضہ کر لیا اور ۱۲ ستمبر ۴۵ء کو انقلابی حکومت قائم کر لی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ہند چین کے عوام نے جاپانی فسطائیوں کے خلاف جنگ کی لیکن جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو فرانسیسی استعمار نے اس علاقے پر اپنا حق جتاتے ہوئے ہند چین کی آزادی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہاں دوبارہ اپنی فوجیں اتار دیں۔

فرانسیسی استعمار کی اس نئی جارحیت کے خلاف ویت نامی عوام نے ۱۹ دسمبر ۴۶ء کو اعلان جنگ کر دیا۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر ہوچی منہ نے اپنی تقریر میں کہا۔

"میرے ساتھیو! جن کے پاس رائفلیں ہیں،
وہ رائفلیں استعمال کریں جن کے پاس تلواریں ہیں وہ
تلواریں اٹھائیں اور جن کے پاس تلواریں بھی نہیں وہ
بیلچے، درانتیاں اور ڈنڈے لے کر میدان میں نکل آئیں
اور نوآبادیاتی نظام کا ہر نشان مٹا ڈالیں۔"

ویت نام میں بمباری کے لئے مغربی جرمنی سے، بلیک مارکیٹ کے دام پر بم خریدے گئے

امریکی سامراج نے اب اس علاقے میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی کیونکہ اس علاقے کی معدنی دولت اور جغرافیائی اہمیت امریکہ کی خصوصی دلچسپی کا باعث بن گئی تھی امریکی سامراج ہند چینی میں فرانس کی جگہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے ایسی پالیسی اختیار کی کہ آخر کار فرانس کی جگہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ہند چین کے عوام کی بڑھتی ہوئی مزاحمت نے فرانسیسیوں کو پریشان کر دیا تھا۔ فرانسیسی استعمار پسندوں نے ویت نامی عوام کو کچلنے کے لئے امریکہ سے فوجی امداد کی درخواست کی امریکی سامراج نے اس علاقہ میں فرانس کی مدد کے لیے اپنی فوجیں تو نہیں بھجوائیں البتہ فوجی امداد سود پر فرانس کو ملنے لگی۔

۱۹۵۳ء میں امریکی محکمۂ خارجہ نے فرانسیسیوں کو ۱۷ کروڑ چھوٹے ہتھیاروں کی گولیاں، سولہ ہزار ٹرانسپورٹ گاڑیاں، ۵۰۰ بکتر بند گاڑیاں، ۳۵۰ فوجی ہوائی جہاز، ۲۵۰ چھوٹے بحری جہاز دس ہزار پانچ سو ریڈیو سیٹ اور نوے ہزار خود کار چھوٹے ہتھیار مع گولیاں مہیا کئے۔

امریکہ کی اتنی زبردست فوجی امداد کے باوجود ویت نامی عوام نے فرانسیسیوں کا جینا دوبھر کر دیا اور آخر کار ۱۹۵۴ء میں ڈین بین پھو کے مقام پر فرانس کی ۲۱ بٹالین فوج اور ایک درجن فوجی کمپنیاں فوج آزادی کے گھیرے میں آگئیں۔ امریکی ہوائی جہازوں نے ان کی مدد کے لئے ہر روز چار سو ٹن اسلحہ گھرے ہوئے فوجیوں پر پھینکا لیکن ۱۳ مارچ ۵۴ء کو فوج آزادی نے اپنے بھرپور حملوں سے فرانسیسی استعمار کے قلعہ کو پاش پاش کر دیا۔ تمام امریکی اسلحہ اور سولہ ہزار فوج عوامی افواج کے ہتھے چڑھ گئی اور جنرل ڈی کاسٹریز کو گرفتار کر لیا گیا۔

جب فرانس کی فوجیں واپس ہوئیں

۲۶ اپریل ۱۹۵۴ء کو جنیوا کانفرنس میں جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ فرانسیسی افواج کے انخلاء کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ جولائی ۱۹۵۶ء تک شمالی اور جنوبی ویت نام میں انتخابات کروا کر اس کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام کی مرضی کے مطابق کر دیا جائے اور بیرونی مداخلت پر پابندی عاید کر دی گئی۔ لیکن صدر آئزن ہاور نے اعلان کیا کہ امریکہ معاہدہ جنیوا کا پابند نہیں اور نہ ہی امریکہ جنیوا کانفرنس میں اپنے آپ کو ایک فریق تسلیم کرتا ہے۔ یہیں سے امریکی مداخلت کا آغاز ہوتا ہے۔ نیو یارک ٹائمز ۱۲ فروری ۱۹۵۰ء لکھتا ہے کہ "ہند چین ایک ایسا علاقہ ہے جسے حاصل کرنے کے لئے امریکہ بڑے سے بڑا داؤ لگا سکتا ہے۔ شمال میں ٹن۔ زنک۔ میگنیز۔ ٹنگسٹن کوئلہ۔ ٹمبر اور چاول۔ جنوب میں۔ چاول ربڑ۔ چائے۔ جانور اور کھال یہ ایسی دولت ہے جسے حاصل کرنے کے لئے امریکہ انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا۔"

امریکہ نے ویت نام میں اپنے ڈرامے کا آغاز نگو ڈین ڈیم کو امریکی نائٹ کلبوں کے شہنشاہ باؤ ڈی کا وزیر اعظم بنا کر کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں نگو ڈین نے نام نہاد انتخابات کروائے اور باؤ ڈی کو برطرف کر کے خود سربراہ بن گیا۔ نومبر ۱۹۵۵ء میں امریکہ نے نگو ڈین کو براہ راست فوجی امداد دینے کا اعلان کیا اپریل ۱۹۵۶ء میں جب تمام فرانسیسی فوجیں ویت نام سے نکل گئیں تو امریکی افواج نے ایڈوائزری گروپ کے پردے میں انکی جگہ لینی شروع کر دی ۱۹۶۵ء میں ان فوجی مشیروں کی تعداد دو سو سے پچاس ہزار ہو گئی اور ۱۹۶۶ء میں تین لاکھ اور ۱۹۶۸ء میں پانچ لاکھ تک پہنچ گئی خود ویت نام کی پٹھو حکومت نے تقریباً سات لاکھ فوج امریکی سرمایہ سے اپنی علیحدہ تیار کر لی۔ اور ویت نام میں بربریت کو انتہا تک پہنچا دیا۔

جنگ آزادی، جنوبی ویتنام میں

۱۹۶۰ء میں جنوبی ویت نام کی سولہ سیاسی جماعتوں نے اپنی ایک مشترکہ تنظیم قائم کر لی۔ جس کا نام نیشنل لبریشن فرنٹ رکھا گیا۔ اور ویت نام کے ایک محب وطن وکیل نگوین ہو تھو کو اس تنظیم کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اس طرح شمالی ویت نام اور جنوبی ویت نام کے عوام نے ایک ساتھ امریکی سامراج کے خلاف جنگ آزادی شروع کر دی اور جنوبی ویت نام کا ۴/۵ حصہ آزاد کرا لیا۔

امریکی سامراج کو ویت نام میں جس تباہی کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ صرف ۱۹۶۵ء میں ہونیوالے نقصان سے لگایا جا سکتا ہے۔

امریکی فوجی جو مارے گئے	انیس ہزار دو سو
جنوبی ویت نام کے فوجیوں کی ہلاکت	تقریباً ۶۷,۵۰۰
دشمن کی ریل گاڑیاں جو تباہ کی گئیں	۴۶
امریکی جہاز جو تباہ کئے گئے۔	۱۲۳۷
فوجی گاڑیاں جو تباہ کی گئیں۔	۱۹۶۰
جہاز جو ڈوبے گئے۔	۱۶۶
دشمن کے فوجی جو عوامی فوج میں شامل ہوئے	۶۰,۰۰۰ (ساٹھ ہزار)
اسلحہ جو عوامی فوج کے قبضے میں آیا۔	۲۷,۰۰۰ (ستائیس ہزار)
۱۹۶۴ء تک جنوبی ویت نام کو دی جانے والی امداد۔ . . .	۱۴ ارب چالیس کروڑ ڈالر
۱۹۶۵ء تک ویت کو بھیجے جانے والا فوجی سامان۔ . . .	۲ ہزار جنگی ہوائی جہاز، آٹھ سو چھوٹے بحری جہاز، کئی کروڑ خود کار اسلحہ

ویت نامی مجاہد طیارہ شکن توپوں سے دشمن کے طیاروں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔

۱۹۶۶ء میں ایک وقت ایسا آیا کہ امریکہ میں بموں کا تمام ذخیرہ ختم ہو گیا چنانچہ مغربی جرمنی سے بلیک مارکٹ کے دام پر بم خریدے گئے۔ جنوبی ویت نام کو جنگ پر صرف ۱۹۶۳ء میں دس ہزار دو سو ملین ویت نامی روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے ان کی معیشت تباہ ہو گئی اب کھانے پینے کی چیزیں بھی امریکہ مہیا کرتا ہے۔ ویت نام کی جنگ جہاں امریکی سامراج کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی وہیں امریکہ کے اجارہ داروں کے لئے زبردست کمائی کا ذریعہ بھی بن گئی ہے لاس انجیلز کی تھر ماڈور کمپنی نے ہر ماہ ویت نام کے لئے پانچ لاکھ ۲.۷۵ انچ والے راکٹ اور چالیس ہزار بم تیار کئے۔ جس کا منافع اسے تین سو فیصد حاصل کیا۔ یونائیٹڈ ایئر کرافٹ کمپنی نے ۷۰ فیصد منافع صرف ہوائی جہازوں کی فروخت سے حاصل کیا، لاک ہیڈ ایئر کرافٹ کو ویت نام کے لئے ۱۰ کھرب ڈالر کے فوجی اسلحہ کا آرڈر ملا۔ کمرشل ہوائی جہازوں کی کمپنیوں نے فوجی سامان کی ترسیل میں کروڑوں ڈالر کمائے۔ ادویات کے کارخانہ داروں کو کروڑوں کا منافع ہوا۔ ٹیکسٹائل ملوں نے فوجی وردیاں بنا کر کروڑوں روپیہ کمایا۔ چمڑے کے تاجروں نے فوجی بوٹوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر ۱۲ سے ۱۵ فیصد تک دام میں اضافہ کر دیا اور سینکڑوں کروڑ پتی ارب پتی بن گئے۔!

جنگ اور امریکی سربراہ

صدر جانسن امریکہ کے غالباً وہ پہلے صدر ہیں جنہیں امریکی اور سارے دنیا کے عوام کی بے پناہ نفرت کا سامنا محض ویت نام کی جنگ کی وجہ سے کرنا پڑا۔ صدر نکسن کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے امریکی عوام سے ویت نام میں جنگ بند کرنے کا وعدہ کیا۔ اور پھر ویت نام میں جنگ کو مزید جاری رکھنا اس لئے بھی امریکی سامراج کے لئے مشکل ہو گیا تھا کہ ہر روز امریکہ کے جانی اور مالی نقصان میں اضافہ ہو رہا تھا دوسرے دنیا کی رائے عامہ امریکہ کے سخت خلاف ہوتی جا رہی تھی چنانچہ نکسن حکومت نے بظاہر ویت نام سے امریکی فوجوں کی واپسی کا اعلان کیا ہے اور کچھ فوجیں واپس بھی بلائی جا رہی ہیں لیکن ہند چینی کی جغرافیائی حیثیت اور جنوب مشرقی ایشیا میں امریکی مفادات کی حفاظت کیلئے ہند چینی پر امریکی سامراج کا تسلط کسی نہ کسی شکل میں ضروری ہے۔ چنانچہ امریکی محکمۂ دفاع نے کانگریس کو بجٹ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ "امریکہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس علاقے میں اپنی فوجی برتری کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھے۔"

اسی پس منظر میں اگر ہم کمبوڈیا اور لاؤس میں امریکہ کی بڑھتی ہوئی فوجی کارروائیوں کا جائزہ لیں تو امریکہ کے ناپاک مقاصد بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ امریکہ کی ساری فوجی منصوبہ بندیاں بنیادی طور پر امریکہ کے اقتصادی مفادات کے تابع ہوتی ہیں۔ امریکہ کے فوجی منصوبہ بندی کے ماہرین نے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں جو نئی پالیسی ترتیب دی ہے وہ تین اصولوں پر مشتمل نظر آتی ہے! یہ نیا منصوبہ سابق وزیر دفاع رابرٹ میکنامارا کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہے۔

۱۔ ایشیائی ملکوں میں براہ راست فوجی مداخلت سے بچتے ہوئے اپنی پٹھو حکومتوں کو مضبوط کرنا اور جہاں پٹھو حکومتیں موجود نہیں وہاں سی آئی اے کی مدد سے پٹھو حکومتیں قائم کرنا۔ انہیں امریکی فوجی اسلحہ سے لیس کرنا، امریکی فوجی مشیروں کی ہدایات پر چلانا اور ہمیشہ فوجی اور اقتصادی طور پر اپنا محتاج رکھنا۔

۲۔ ۱۹۷۱ء میں برطانیہ کے انخلاء سے جو سامراجی خلاء پیدا ہو گا اسے پُر کرنے کے لئے ایک اینگلو سیکسن معاہدہ کی تشکیل کرنا جس میں امریکہ، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا شامل ہوں اور بالآخر جنوبی افریقہ کی یونین کو بھی اس معاہدہ میں گھسیٹ لینا۔

۳۔ امریکی افواج کی ایشیائی سرزمین پر غیر موجودگی کی کمی کو پورا کرنے کے لئے امریکہ میں ایک ایسا "فائر بریگیڈ" بنانا جو گوریلا جنگ میں مہارت رکھتا ہو اور جس کو تیزی کے ساتھ کسی بھی علاقے میں پہنچایا جا سکے۔!

امریکہ اور اس کے حلیف

اس منصوبے کے تین بنیادی حصوں کی مختلف تشریح یوں ہو سکتی ہے۔ امریکہ نے بیرونی اقتصادی امداد اور فوجی امداد کا پروگرام کچھ اس طرز پر بنایا ہے کہ تقریباً تمام نو آزاد ملکوں میں امریکی امداد پر پلنے والا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنے ملکی مفادات پر اپنے گروہی اور سامراجی مقاصد کو ترجیح دیتا ہے۔ بیشتر ملکوں میں یہی امریکہ نواز طبقہ برسر اقتدار ہے۔ اس گروہ یا طبقے کے اقتدار سے امریکہ کو دو طرح کے فائدے حاصل ہوتے ہیں پہلا یہ کہ ان ملکوں میں امریکہ کو اپنی فوجیں رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ امریکہ کے پٹھوؤں کی فوج خود امریکہ کی فوج کی ذمہ داریاں پوری کرتی ہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ امریکہ نو آزاد ملکوں کی براہ راست نفرت سے بچ جاتا ہے۔ اس نوعیت کی حکومت کی بہترین مثال تھائی لینڈ ہے۔ تھائی لینڈ کی افواج پر سو ملین ڈالر سالانہ امریکہ خرچ کرتا ہے۔ جس سے تھائی لینڈ کے ایک لاکھ فوجیوں کے لئے M-16 رائفل، مشین گنیں، ریڈیو اور دوسرے جنگل کی جنگوں میں ضرورت کی چیزیں خریدی جاتی ہیں۔ تھائی لینڈ کی اسپیشل فورس کو امریکی انسٹرکٹر تربیت دیتے ہیں اور انہیں جنگ کا عملی تجربہ حاصل کرنے کے لئے ویت نام وغیرہ بھیجا جاتا ہے۔ ان فوجوں کی گوریلا تربیت سے امریکہ جہاں چاہے انہیں مخالف گوریلا کارروائیوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔!

امریکہ اپنے پٹھو ملکوں میں اس قسم کی بے قاعدہ فوج اپنے مشیروں کی نگرانی میں تیار کراتا ہے جو باقاعدہ فوج کے کنٹرول سے تقریباً آزاد رہتی ہے انہیں رینجرز یا اسپیشل فورس کا نام دیا جاتا ہے۔ جنوبی ویت نام میں "سویلین بے قاعدہ ڈیفنس گروپ" کے نام سے مونٹاگنارڈ قبائل پر مشتمل یونٹ بنائے گئے ہیں۔ جنہیں سرحدوں پر متعین کیا گیا ہے ان یونٹوں کو لاؤس اور کمبوڈیا کے خلاف سرحدی کارروائیوں میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسی طرز پر کچھ یونٹ اور بنائے گئے ہیں، جنہیں (ARMEE CLANDETINE) کہا جاتا ہے یہ یونٹ میو قبائل پر مشتمل ہیں جو ۱۹۵۱ء سے لاؤس میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ کام اس وقت ممکن ہے۔ جب مقامی حکومت امریکہ کے دلالوں کے ہاتھ میں ہو، چنانچہ اسی مقصد کی وضاحت کے لئے ۱۵ جنوری کو وزیر دفاع کلیرڈ نے کانگریس کے نام اپنے ایک غیر معمولی پیغام میں کہا "ایشیاء میں ہمارے مشترکہ مقاصد کے لئے "دوست ملکوں" کو مضبوط تر بنانا ضروری ہے" امریکہ جن ملکوں پر غیر معمولی اعتماد کرتا ہے ان میں کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امریکی

ویت کانگ کی فاتحانہ پیش قدمی نئے مرحلے میں داخل ہو گئی

نوم پنہ۔ ویت کانگ نے کمبوڈیا کے دارالحکومت نوم پنہ پر حملہ کر کے وسطی علاقے میں تباہی مچا دی، بین الاقوامی ایئر پورٹ تک پہنچ گئے اور اسے تباہ کر دیا، اس حملے میں کم از کم دس ہوائی جہازوں کے علاوہ نیپام بم اسلحہ اور پٹرول کے ذخیرے تباہ کر دیئے گئے، پوچینتانگ ایئر پورٹ پر ویت کانگ کا حملہ ڈرامائی رہا۔ اس اڈے کو غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ ایک فوجی ترجمان نے بتایا ہے کہ پوچینتانگ پر بہت "اہم" نقصان ہوا ہے، واضح ہو کہ یہاں کمبوڈیا کی امریکی فضائیہ کے مگ۔ ۱۷ ٹی۔ ۲۸ اور جیٹ فائٹر جہاز کھڑے ہوتے ہیں۔ اس ہوائی اڈے پر تیس کمبوڈیائی فوجیوں کی لاشیں پڑی ہیں، لاشوں اور زخمیوں کے کئی ٹرک دارالحکومت میں داخل ہوتے دیکھے گئے۔

سیاسی حلقوں نے اس حملے کو ویت کانگ کے حملوں کے نئے مرحلے کا آغاز کہا ہے۔

پورے ایشیا میں جنگی کارروائیوں کیلئے امریکہ ایک ریزرو فورس تیار کر رہا ہے

محکمۂ دفاع کی ایسی پالیسیاں جن سے دوسرے "دوست ملک" بے خبر رہتے ہیں، ان تینوں ملکوں کو باخبر رکھا جاتا ہے۔ ان ملکوں کے فوجی افسروں کو پنٹاگن کی خفیہ سروس کی رپورٹیں ملتی ہیں، اور فوجی منصوبہ بندی کی خفیہ میٹنگوں میں انہیں شریک کیا جاتا ہے یہ تینوں ملک (ANZ US) پیکٹ کے علاوہ سیٹو سے بھی منسلک ہیں آسٹریلیا کی نسلی امتیاز کی پالیسی امریکی مفاد کے عین مطابق ہے اور امریکی سامراج کی عالمی پالیسیوں میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ مکمل طور پر امریکی کے ساتھ ہیں۔ بحر ہند اور (SOUTH PECIFIE) پر کنٹرول کے لئے نیوزی لینڈ کے مقام کنٹربری اور آسٹریلیا میں شمالی مشرقی کیپ میں جو مواصلاتی اسٹیشن قائم کئے جا رہے ہیں وہ ارٹیریا کے بعد سب سے بڑے امریکی مواصلاتی اسٹیشن ہوں گے۔۔ یہی وہ قریبی تعلقات ہیں۔ جو اینگلو سیکشن معاہدہ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیاء میں اس اتحاد کی ضرورت برطانیہ کے اس علاقے سے انخلا کے وجہ پیش آ رہی ہے۔ امریکہ اس (Anglo-saxonalliance) کے ذریعہ اس علاقے میں فضائی اور بحری کارروائیوں میں استعمال ہونے والے ہوائی جہازوں جہازوں اور بحری جہازوں وغیرہ کے لئے اسٹاپ ریپیئر، اور سپلائی کی ضرورتیں پوری کرنا چاہتا ہے۔

بحر ہند کا جزیرہ: ایک نیا اڈہ

جنوب مشرقی ایشیاء میں اس وقت امریکہ کا سب سے بڑا اڈہ سائیگان میں واقع ہے۔ اسی ہیڈ کوارٹر سے لاؤس، شمالی ویت نام اور کمبوڈیا کے خلاف کی جانیوالی کارروائیوں کو کنٹرول کیا جاتا ہے، جاپان میں اوکی ناوا کا اڈہ جنوب مشرقی ایشیا پر کنٹرول کرنے کا سب سے بڑا ہیڈ کوارٹر ہے جہاں سے ۵۲بی جہاز پرواز کرتے ہیں اسی اڈے پر ایٹمی ہتھیار کا ذخیرہ موجود ہے لیکن پچھلے چند برس سے اڈے کے خلاف جاپانی عوام کے بڑھتے ہوئے احتجاج نے امریکہ کے محکمہ دفاع کو پریشان کر دیا ہے۔ اگرچہ کہ ساتو حکومت نے ۱۹۷۲ء تک اس اڈے کو نہ ہٹانے کی ضمانت دی ہے اولی ناوا کی کمی کو پورا کرنے کے لئے امریکہ نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں پہلے ہی تبادل انتظام کر رکھے ہیں اور مستقل سہولتوں کے لئے جگہ کی تلاش جاری ہے اس سلسلے میں برطانیہ کے زیر نگرانی "مانگرونیسا" کے جزائر کا نام لیا جا رہا ہے۔ جو برطانوی ہند کے سمندری علاقے میں واقع ہے۔!

اس منصوبے کے تحت میکنامارا صاحب امریکہ میں ایک ایسی فوج قائم کرنا چاہتے ہیں جو سامراجی فوجوں کی واپسی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خلاء کو پورا کر سکے ۱۹۶۵ء میں کانگریس کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا تھا۔ یا تو ہم ایشیاء کے ان تمام علاقوں میں جہاں کمیونسٹ خطرہ موجود ہے بڑی تعداد میں فوج اور جنگی ساز سامان رکھ سکتے ہیں یا پھر ہمیں ایک ایسی چھوٹی سی سنٹرل ریزرو فورس بنانی پڑے گی۔ جسے ضرورت کے وقت تیزی کے ساتھ کسی بھی علاقے میں پہنچایا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے ایسے بڑے ٹرانسپورٹ طیاروں کی ضرورت ناگزیر ہے جو فوج اور جنگی ساز سامان کو تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا سکیں۔ سی ۱۲۴ گلوب ماسٹر اور سی ۱۴۱ اسٹار فائٹر اس ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔ میکنامارا نے اس ضرورت کے لئے (EXHLS) طیاروں کا منصوبہ پیش کیا پیش کیا جواب (E.S.A) مشہور ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں اس قسم کے ۱۲۰ طیارے بنانے کا پروگرام کانگریس کو پیش کیا

کمبوڈیا میں حملے کا "جواز" یہ پیش کیا گیا کہ اس طرح امریکی فوجیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گی

گیا۔ جس پر چھ بلین ڈالر لاگت آتی ہے کانگریس کے اعتراض پر ان طیاروں کی تعداد گھٹا کر ۸۱ کو دی گئی۔ اس منصوبے کے تحت قائم کی جانے والی فورس کو خصوصی گوریلا جنگ کی تربیت بھی دی جائے گی تاکہ جنوب مشرقی ایشیاء کے کسی بھی ملک کے عوام کی گوریلا کارروائیوں کا سدباب کیا جا سکے۔ انتہائی بلند پہاڑی علاقوں میں اور جنگلوں میں لڑی جانے والی گوریلا جنگ کی تربیت دینے کے بعد اس فورس کے تقریباً دو سو جوانوں کے ایک گروپ سے جولائی اور اگست ۶۹ء کے درمیان آزمائشی جنگ بھی کروائی گئی

مندرجہ بالا امریکی منصوبوں کی روشنی میں کمبوڈیا کی پچھلے سال کی سامراج نواز فوجی بغاوت اور لاؤس کی صورت حال کے جائزہ سے امریکی سامراج کے ناپاک مقاصد کی تصدیق ہو جاتی ہے

یوں تو کمبوڈیا میں امریکی کی بالواسطہ اور بلاواسطہ مرضی خلاف ورزیاں ۱۹۶۲ء کے بعد سے بھی جاری تھیں۔ لیکن ۳۰ اپریل ۱۹۷۰ء کی شب کو صدر نکسن نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت جب کہ میں آپ سے مخاطب ہوں امریکی فوجیں کمبوڈیا میں فوجی اڈوں کو ختم کرنے میں مصروف ہیں۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ دس ہزار امریکی فوجوں نے کمبوڈیا پر زبردست حملہ کر دیا، کیونکہ سریک ماتک اور لون نول کی فوجی حکومت پرنس سہانوک کی وفادار فوج اور کمیونسٹوں کی بغاوت پر قابو پانے میں ناکام ہو گئی تھی، اس حملہ کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ اس کارروائی سے امریکی فوجوں کی جانیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گی۔ اور ویت نام میں کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہو جائیں گے۔ مارچ ۱۹۷۰ء میں جب پرنس سہانوک اپنے علاج کے سلسلے میں یورپ گئے تو کمبوڈیا کی امریکی نواز طاقتوں نے حکومت کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے۔ آخرکار ۱۸ مارچ کو کمبوڈیا کی نیشنل اسمبلی اور شاہی کونسل نے شہزادہ سہانوک کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر دیا۔ اور اسمبلی کے چیئرمین چینگ ہنگ کو عارضی طور پر صدر مملکت بنا دیا لیکن اقتدار حقیقی معنوں میں کمبوڈیا کی فوج کے دو امریکی پٹھو جنرل سرک ماتک اور لون نول کے ہاتھ میں تھا۔

غیر جانبدار حکومتوں کے خلاف سازش

پرنس سہانوک کی غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی ابتداء ہی سے امریکی سامراج کی نظر میں کھٹک رہی تھی۔ امریکہ کسی نوآزاد ملک میں غیر جانبدار حکومتوں کو اپنے لیے مستقل خطرہ سمجھتا ہے لہٰذا اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ انتخابات کے ذریعہ ممکن نہ ہو تو فوجی بغاوت کے ذریعہ ایسے جنرلوں کو برسر اقتدار لائے جو داخلی اور خارجی طور پر امریکی پالیسیوں کی پیروی کریں۔

لاؤس میں بھی امریکی سامراج ۱۹۵۴ء کے بعد سے مسلسل مداخلت کرتا چلا آ رہا ہے لاؤس اور کمبوڈیا میں مداخلت کا جواز امریکی سامراج ہمیشہ یہ پیش کرتا رہا کہ ان علاقوں میں ویت کانگ پناہ لیتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ان ملکوں میں امریکی کارروائیوں کا مقصد صرف سامراج دشمن طاقتوں کو کمزور کرنا ہے۔ ۱۹۵۴ سے قبل لاؤس میں محاذ جنگ پارٹی نے ۹ سال تک فرانسیسیوں سے جنگ کر کے انہیں معاہدہ جنیوا پر مجبور کر دیا تھا لیکن فرانسیسی سامراج

کی جگہ امریکی سامراج نے لے لی ۔ امریکی سامراج کی مسلح اور براہ راست مداخلت کے باوجود لاؤس اور کمبوڈیا میں سامراج دشمن طاقتیں موثر کارروائیاں کر رہی ہیں ۔ صرف پچھلے چار سال کے عرصے میں لاؤس کے محب وطن عوام نے آٹھ سو کے قریب امریکی طیارے مار گرائے ہیں پچھلے سال انہوں نے بہت سارے مقبوضہ اڈوں کو آزاد کرا دیا ہے اور آزاد علاقوں کو مستحکم کر لیا ہے اس وقت لاؤس کا تقریباً دو تہائی علاقہ عوام کے ہاتھوں میں ہے اور نصف سے زیادہ آبادی آزاد ہو چکی ہے اب صورت یہ ہے کہ ٹرونگ سنگ پہاڑوں کے دونوں طرف دریائے میکانگ کے نچلے علاقے پہاڑی علاقوں سے میدانوں تک ہند چینی کے تینوں ملکوں کے حریت پسند میدان جنگ میں ایک ہو گئے ہیں اور متحد ہو کر امریکی سامراج کی پٹائی کر رہے ہیں بہت سے صوبوں کا ؤنٹیوں اور کئی سو قصبوں میں عوامی حکومت قائم ہو چکی ہے ۴۲ ہزار سے زیادہ مقامی اور امریکی فوجوں کو ہلاک و زخمی کیا جا چکا ہے ۔ فنم پنہ سے مختلف صوبوں تک دشمن کی بہت سی مواصلات کی لائنیں کاٹ دی گئی ہیں لون نول اور سریک ماٹک کی ٹولی کے ہزاروں فوجی عوامی افواج سے مل گئے ہیں ۔ جنگی اہمیت کے اہم مقام جارس کے میدان شینگ کھونگ کے علاقے آزاد کرانے کے بعد ایک اور اہم سرحدی مقام کا آٹو پو جو ۔ اور اس سے ملحقہ اڈوں کو آزاد کرا لیا ہے ۔

دشمن کے نقصان کی تفصیل

مارچ ۷۰ سے جولائی ۷۰ تک صرف پانچ ماہ میں کمبوڈیا کے حریت پسند عوام کے ساتھیوں امریکہ اور ان کے پٹھوؤں کو جو نقصان اٹھانا پڑا اس کی تفصیل یہ ہے ۔

۲	امریکی بریگیڈیئر	تباہ کئے گئے ۔
۹۰	امریکی بٹالین کو	نقصان پہنچایا گیا
۱۰۰	ہوائی جہاز	مار گرائے گئے
۵۰۰	فوجی گاڑیاں	تباہ کی گئیں
۵۰۰	ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں	تباہ کی گئیں
۲۵۰۰	ٹن گولہ بارود	تباہ کیا گیا ۔
۱۰۰۰۰	ہتھیار	قبضے میں کئے گئے
۴۰۰۰۰	لون نول کے سپاہی	ہلاک و زخمی ہو گئے
۲۵۰۰۰	جنوبی ویت نامی	〃 〃 〃
۱۰۰۰۰	امریکی سپاہی	〃 〃 〃
(۱)	جنوبی ویت نامی لفٹننٹ کرنل	ہلاک ہوا
(۱)	امریکی کرنل	زخمی ہوا

۲۹ ۔ اپریل سے ۱۶ مئی ۷۰ تک کیانگ چپانگ ، سوئنگ اور دوسرے صوبوں میں دشمن کے ۲۵ ہزار سپاہیوں کو جن میں دو ہزار امریکی سپاہی بھی شامل ہیں ہلاک اور زخمی کیا گیا ۔

لاؤس میں صرف ۷۰ء کے دوران لاؤس کے عوام کے ہاتھوں امریکیوں کا نقصان

۱۶۰۰۰	سپاہی	ہلاک کئے گئے
۲۰۷	ہوائی جہاز	تباہ کئے گئے
۲۴۸	فوجی گاڑیاں	تباہ کر دی گئیں
۸۲	لانچوں اور کشتیوں کو	ڈبو دیا گیا
۴۰۰۰	ٹن گولہ بارود	تباہ کر دیا گیا
۲۵۰۰	مختلف قسم کے ہتھیار	قبضے میں لئے گئے

نام باک کے علاقے کو دشمن سے آزاد کرا لیا گیا لاؤ نامگم کے علاقے پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا

۱۹۷۰ء میں دشمن کا نقصان

۱۲۱۰۰۰	سپاہی	ہلاک و زخمی
۳۱۱	ہوائی جہاز	گرائے گئے
۴۳۱	فوجی گاڑیاں	تباہ کی گئیں
۱۰۲	کشتیاں اور لانچ	غرق کی گئیں
۷۵۰۰	ٹن گولہ بارود	تباہ کیا گیا
۵۴۰۰	ہتھیار	چھین لے گئے

ہند چینی میں تینوں ملکوں کے عوام کے لئے جو بہتر پوزیشن حاصل ہوئی ہے وہ اس تاریخی قانون کا ایک ثبوت ہے کہ منصفانہ نصب العین کو زبردست امداد و تعاون حاصل ہوتا ہے ایک کمزور ملک طاقتور ملک کو شکست دے سکتا ہے ایک چھوٹے ملک کے عوام یقیناً بڑے ملک کی جارحیت کو ناکام بنا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ جدوجہد کرنے اور ہتھیار اٹھانے کی جرأت کریں اور اپنے ملک کی قسمت خود اپنے ہاتھ میں لیں" ویت نام کمبوڈیا اور لاؤس میں امریکی جارحیت میں پچھلے چند ماہ سے جو اضافہ ہوا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان علاقوں میں عوامی طاقتیں اور زیادہ منظم اور مضبوط ہو گئی ہیں امریکی سامراج کی یہ جارحیت اس کی پسپائی کا ثبوت ہے کیونکہ رجعت پسند طاقتیں اپنی تباہی کے قریب پہنچ کر اور زیادہ خونخوار ہو جاتی ہیں ۔ خود کو بچانے کے سلسلے میں یہ ان کی آخری ناکام کوشش ہوتی ہے

چین میں کمیون کے انقلابی تجربے کے ثمرات

چین نے اپنے کمیون کے نظام کی بدولت زراعت نظام آبپاشی، صنعت اور فنی مہارت میں بے مثل کامیابیاں حاصل کی ہیں ۔ یہ سب فیضان اجتماعی محنت کا ہے ، تمام وسائل، تمام محنت کشوں کی امانت ہیں ۔ یہی وہ نظریہ ہے، جس نے وسائل کی کمی کے باوجود چین کی کایا پلٹ دی

اکتوبر ۱۹۵۸ء تک ٹنگ کمیون میں ۱۵۵ افراد کی کمیون کانگریس کا چناؤ ہو چکا تھا ۔ جس کے تحت سات شعبے زراعت اور پانی کے ذخیرے صنعت اور مواصلات ، جنگلات اور حیوانات ، خزانہ اور تجارت تعلیم و صحت ، محنت اور بہبود عامہ اور امور داخلہ کے علاوہ منصوبہ بندی کمیشن اور انسپکشن کمیشن بھی بڑے فعال اور موثر انداز میں کام کر رہے تھے ۔ افرادی قوت ، ۲ پیداواری دستوں میں منظم کی گئی تھی جس میں ۷۰ پیداواری بریگیڈ ٹیمیں شامل تھیں ۔ ہر گاؤں اور گھر میں سہولت کے مطابق عوامی باورچی خانے ، نرسریاں کنڈر گارٹن اور تعلیم بالغاں کے ادارے قائم ہو چکے تھے ۔ پچاس سے زائد پانی کنٹرول کرنے کے منصوبے مکمل ہو چکے تھے جن سے ۸۰ فیصد قابلِ کاشت اراضی کی آبپاشی کے لئے پانی کا ذخیرہ موجود تھا ۔

صنعت و حرفت نے بھی خوب ترقی کی ، یہاں صرف ایک بڑھئی اور دو لوہاروں کی دکانیں تھیں ، چھ ماہ کے اندر ایک ہزار ، ایک سو بیالیس ورکشاپیں اور فیکٹریاں بن گئیں جہاں دس ہزار افراد کام کرتے تھے ۔ فیکٹریوں میں کپڑا ، کاغذ خوردنی تیل ، چینی اور دوسری دھاتوں کے برتن ، ظروف تیار ہوتے تھے ۔ اس کے علاوہ لوہے کے اوزار ، بھٹیوں کے لئے اینٹیں سیمنٹ اور کھاد بھی تیار کئے جانے لگے ۔ مزید براں اگلے سال کے دوران سات مزید ورکشاپیں اور فیکٹریاں قائم کرنے کا منصوبہ زیر غور تھا ۔

کمیون سے سب سے زیادہ فائدہ پس ماندہ ترین علاقوں کو ہوا ۔ مغربی ینان کی ایک چھوٹی قومیت لیسس کے لوگ سرمایہ داری یا جاگیرداری تو کجا ابھی تک غلامی کے دور سے بھی زیادہ پسماندہ تھے ۔ بعض اوقات چند سکوں کے عوض بھاری سامان پہاڑوں پر سے گزارنے کا کام بھی کرتے تھے اور اکثر ان کی لاشیں موسم بہار میں پگھلنے والی برف کے نیچے سے برآمد ہوتی تھیں آزادی سے قبل ان کی زندگی حیوانوں سے بدتر تھی ، مگر آزادی کے بعد ان کی زندگی بھی سنور گئی ۔ اور انہیں پہلی بار آزادانہ استعمال کرنے کا موقع ملا ان کے علاقے میں سڑکیں تعمیر ہوئیں اور انہیں بہبودی فنڈ اور قومی مساوات نصیب ہوئی ۔ ۱۹۵۵ء میں غلے کی پیداوار دگنی ہو گئی ، پھر یہ علاقہ چند مقامی لوگوں کی قیادت میں خود مختار ضلع بن گیا اور کمیون کی اصلاحات کے ذریعہ صدیوں کا پس ماندہ اور مفلوک الحال علاقہ دیکھتے دیکھتے ایک خوشحال اور قابلِ رشک علاقہ میں تبدیل ہو گیا ۔

تبصرہ

سلاطینِ ہند اور اشاعتِ اسلام

از ۔ ڈاکٹر حافظ محمد اسحاق خلیل

• ملنے کا پتہ ۔ کراچی بک ڈپو ۔ اردو بازار ۔ کراچی

صفحات ۔ ۱۰۰

قیمت ۔ تین روپے

تاریخ، محض ماضی کے سلسلۂ واقعات کا مجموعہ نہیں، بلکہ اس کے اوراق، مبالغے، تخمین و ظن، قیاس آرائی اور تاویلات سے پُر ہیں اور مؤرخ کا اصل کام اس طومار میں صحیح واقعات کی نشاندہی ہے یہ کام محض تلاش کی حد تک مشکل نہیں بلکہ دشوار تر اس لئے بھی ہے کہ جذبات سے کنارہ کش ہو کر جس صوفیانہ لاتعلقی اور سفاکانہ صدق گوئی کی ضرورت تاریخ نویسی میں ہوتی ہے، وہ کمیاب ہی نہیں نایاب ہے۔ اربابِ دانش علمی معاملے میں اپنے عقائد اور تعصبات اور اپنی پسند اور ناپسند کی بنا پر بالعموم رائے قائم کرتے ہیں۔ پھر اس کے حق میں شواہد اکٹھا کرتے ہیں۔ نتائج پہلے مرتب کئے جاتے ہیں۔ مطلوبہ حقائق کی عمارت ان کے اوپر کھڑی کی جاتی ہے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ نویسی میں مناظرے کا انداز ایک روایت کا درجہ رکھتا ہے ۔ ایک طرف تاریخ کی وہ کتابیں ہیں جن میں مسلمان فرمانرواؤں کو تلوار سے اسلام پھیلانے کا "ملزم" "متعصب" اور ظالم قرار دیا جا رہا ہے، دوسری طرف وہ کتابیں ہیں، جن میں مسلمان مورخوں کی طرف سے صفائی پیش کی گئی ہے اور دور از کار الزامات کی دُور از کار تاویلات بیان ہوئی ہیں۔

اسلام پر قرونِ وسطیٰ اور موجودہ زمانے میں جو کتابیں برصغیر کے علاوہ برطانیہ کے مصنفوں نے لکھی ہیں، اس کتاب کے مضامین میں ان کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور توقع کی گئی ہے کہ مغرب کے مصنف بالخصوص منصفانہ نقطۂ نظر سے تاریخ لکھا کریں گے ۔ دسویں اور پندرہویں صدی عیسوی کے دوران میں مسلمان فرمانرواؤں پر اپنی ہندو رعایا کو بالجبر مسلمان بنانے کا الزام عاید ہوتا ہے ۔ انگریز مستشرق اور مورخ یہ الزام ایک دوسرے کے حوالے سے نقل کرتے رہتے ہیں۔ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی پر بھی یہی الزام عائد ہوا ۔ بارہویں صدی میں کول اور کالنجر کے باشندوں نے اسلام قبول کیا اور کہتے ہیں کہ غوریوں نے انہیں بہ جبر مسلمان بنایا ۔ کشمیر میں سلطان سکندر لودھی نے ہندوؤں پر سختی برتی کہ اسلام قبول کریں۔ مصنف نے ان میں سے ہر الزام کو تاریخ کی روشنی میں پرکھا ہے اور ان کا رد کیا ہے۔

سخن (شاعری)

از ۔ حسن اکبر کمال

التحریر ۔ لاہور (کبیر سٹریٹ ۔ اردو بازار)

صفحات ۔ ۱۴۴

قیمت ۔ چار روپے

حسن اکبر کمال ایک نوجوان شاعر ہیں۔ ان کا تعارف جناب احمد ندیم قاسمی نے تحریر کیا ہے اور ان کے فن کو بہت سراہا ہے۔ "اس کے گیت میں بھی گونج ہے اور نعرے میں بھی کھنک ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ نوجوانی میں کہنہ مشقی کے شواہد حسن اکبر کمال نے بڑی فیاضی سے مہیا کئے ہیں۔ سجاد باقر رضوی کا کہنا ہے کہ اس قسم کی شاعری میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس کی مثال میں یہ مصرعہ پیش کیا ہے ۔ ؎

دھیرے دھیرے فاصلے بڑھتے گئے تکرار میں

یا یہ شعر ۔ اب راستہ کٹھن ہے، اکیلا کھڑا ہوں میں!
اب تک جو ساتھ ساتھ تھے، سب اپنے گھر گئے

حسن اکبر کمال نے شاعری کا مواد "انسانی رشتوں میں تلاش کیا ہے" ان کے بیان میں درد کے ساتھ لہجے کا سکون اور مترنم آہنگ ہے۔ انہوں نے روایت کو اپنی ذات میں سمو کر شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام نہ شعری روایت سے الگ نظر آتا ہے اور نہ بالکل روایتی دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ نازک فنی مہارت ہے جو مشکل سے ہی کسی کو ودیعت ہوتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

برس رہا ہے مگر تشنگی نہیں بجھتی
میں ریگ زار ہوں اور وہ گھٹاؤں جیسا ہے
ترے خیال سے بچ کر بت کہاں جاؤں
یہاں سکوت بھی تیری صداؤں جیسا ہے

کل اسے دیکھا تو بیتے دن مجھے یاد آ گئے
جیسے بچھڑے کا زباں پر ذائقہ تازہ ہوا!
کیا فسوں کاری محبت ہے
بات ہوتی ہے لب نہیں ہلتے

التحریر نے یہ مجموعہ دبیز کاغذ پر موجد کے دلآویز سرورق کے ساتھ اہتمام سے چھاپا ہے۔

سوشلزم، قرآن کی روشنی میں

مؤلفہ ۔ عنایت اطہر

قیمت ۔ ایک روپیہ پچاس پیسے

ادارہ ۔ البصائر ۔ وحدت روڈ ۔ لاہور

حالیہ انتخابات کے دوران میں نام نہاد اسلام پسندوں اور رجعت پسندوں کی سرخیل جماعت اسلامی نے سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات کا حق مانگنے والوں کے خلاف کفر کے فتوؤں کا ایک ڈھیر لگا دیا تھا۔ پروپیگنڈے کے محاذ پر سوشلزم کے خلاف کتابچے، پمفلٹوں اور اشتہاروں کا ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ اسلام پسند مقررین انتخابی جلسوں میں سوشلسٹ پارٹیوں کے خلاف آگ اگلتے تھے، محسوس یہ ہوتا تھا کہ معاشی اور سماجی انصاف کے طلب گاروں کے لئے اسلام پسندوں کی عدالت میں ایسی سزائیں تجویز کی جائیں گی کہ قرونِ اولیٰ کی انسانیت سوز سزائیں ماند پڑ جائیں گی۔ لیکن "اسلام پسندوں" نے جذبات کا جو الاؤ دہکایا تھا وہ عوامی فیصلے سے ٹھنڈا پڑ گیا اور یہ بات پوری سچائی سے ظاہر ہو گئی کہ،

"جو شخص کسی کو کافر یا اللہ کا دشمن کہہ کر پکارے، اور وہ ایسا نہیں تو یہ کفر، کہنے والے پر رجوع کرے گا۔"
(الحدیث)

انتخابی محاذ سے ہٹنے کے بعد رجعت پسندوں کا ٹولہ پروپیگنڈے کے محاذ پر اب بھی سرگرمِ عمل ہے ۔ رجعت پسندوں کے اس خطرناک حربے کو ناکام بنانے کے لئے اور فکری محاذ پر ترقی پسند جدوجہد کو جاری رکھنے کے لئے لاہور کے ایک پبلشنگ ادارہ "البصائر" نے ایک دیدہ زیب کتابچہ "سوشلزم، قرآن کی روشنی میں" شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ قرآنی آیات کے حوالے سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ سوشلزم قرآن و حدیث سے متصادم نہیں ہے۔ سوشلزم کا اجتماعی اقتصادی طریق کار سرمایہ دارانہ نظام کے انفرادی انسانیت کش اثرات کے سبب وجود میں آیا ہے۔ قرآن اور سوشلزم دونوں عوام کی سربلندی چاہتے ہیں اور دونوں مالکانہ، مذہبی اور معاشی استحصال کو ظلم قرار دیتے ہیں ۔

"جن کے تم آقا ہو (محنت کش طبقہ) کیا تم انہیں
اس رزق میں، جو ہم تمہیں دیتے ہیں اس طرح شریک کرتے
ہو کہ وہ تمہارے ساتھ برابر کے حصہ دار ہوں؟" ۳۰ : ۲۸
"انسان مال و متاع کے زعم میں سرکش ہو جاتا ہے"
تم کیا سمجھے کٹھن راستہ کیا ہوتا ہے ۔
یہ ہے غلام کو آزاد کرنا اور فاقہ زدہ کو کھانا کھلانا
کسی یتیم رشتہ دار کو یا کسی بیکس غریب کو ۹۰ : ۱۲
اصل متاع تمہارے رب کی وہ رحمتِ خاص ہے
جو اس مال و دولت سے کہیں افضل ہے، جو یہ لوگ اکٹھا
کرتے ہیں ۔" ۴۳ : ۳۱

کتاب میں قرآن کی آیات کی روشنی میں ایسے بے شمار اشارات درج ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن و حدیث کے احکامات و پیغامات سوشلسٹ اصولوں سے کسی طرح متصادم نہیں ہیں۔ اور نام نہاد اسلام پسندوں کے اس ڈھونگ کا پردہ چاک ہو جاتا ہے کہ اگر سوشلسٹ معیشت کو اپنایا گیا تو مذہب کو خطرہ لاحق ہو جائے گا ۔

کتابت اور طباعت صاف ستھری اور دیدہ زیب ہے ۔

گھنٹی

ایک جدید چینی افسانہ

جب تک یہ گھنٹی بجتی رہے گی ہمارے دل ایک دوسرے کے قریب دھڑکتے رہیں گے

مصنّف نے اِس کہانی میں خود تنقیدی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، اور اسے مُلک کی بہترین کہانیوں میں شامل کیا گیا ہے۔

از:- چیہہ میئن   ترجمہ:- نعیم آروی

شیانگ یانگ نامی گاؤں کے آخری سرے پر ایک عمر رسیدہ درخت صدیوں سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا کھڑا ہے اس کی ایک موٹی شاخ پر ایک زنگ آلود گھنٹی لٹکی ہوئی ہے۔ یہ گھنٹی گاؤں والوں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

جاپان کے خلاف جنگ مزاحمت شروع ہوئی تو گاؤں والوں کو خبردار کرنے میں اس گھنٹی نے نمایاں خدمت انجام دی۔ جب کبھی حملے کا خطرہ ہوتا تو گھنٹی بجا کر گاؤں کے چھاپہ ماروں کو خبردار کر دیا جاتا۔ دیہاتی اپنا ضروری سامان لے کر خفیہ پناہ گاہوں میں چلے جاتے۔ اس طرح اگر کبھی گاؤں میں جنگ درپیش ہوتی تو چھاپہ مار بے خوف و خطر دشمن کے دانت کھٹے کر دیتے۔

زرعی اصلاحات کا آغاز ہوا تو گاؤں والوں نے جاگیرداروں کے خلاف ولولہ انگیز مہم شروع کر دی اور بالآخر جاگیرداروں کو عوامی جدوجہد سے مجبور ہو کر اپنا سر جھکانا پڑا۔ اسی قدیم اور گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے درخت کے نیچے گاؤں کی زمینیں کسانوں میں برابر برابر تقسیم کی گئیں۔ گاؤں میں جب امدادِ باہمی کا کام شروع ہوا تو گھنٹی کی آواز اکثر و بیشتر سنائی دینے لگی۔ ہر روز، جب صبح کا اجالا پھیلتا اور سنہری کرنیں کھیتوں، کھلیانوں اور منڈیروں کا منہ چومتیں تو گھنٹی کی مترنم آواز پورے گاؤں میں نئے دن کا مژدہ سناتی۔ بوڑھے درخت کی ایک شاخ پر جھومتی ہوئی یہ گھنٹی دشمن کے خلاف گاؤں والوں کی مشترکہ جدوجہد کی ایک علامت تھی۔ وہ اس گھنٹی کو دیکھ کر کہتے۔

"جب تک یہ گھنٹی بجتی رہے گی ہمارے دل
ایک دوسرے سے قریب دھڑکتے رہیں گے۔"

گاؤں والے جب گھنٹی کے بارے میں گفتگو کرتے تو وہ اس بوڑھے آدمی کو کبھی فراموش نہ کرتے جو سالہا سال سے گھنٹی بجانے کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وانگ موشوئی ایک پرانا، آزمودہ کار بریگیڈ لیڈر تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ میانہ قد کھردرے اور سخت ہاتھ جس پر کڑی مشقت کی آڑھی ترچھی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ سفید خشخشی داڑھی۔ ہر روز پو پھٹنے سے قبل وہ درخت کے قریب پہنچ جاتا اور بلاناغہ گھنٹی بجانے کے فرائض پوری دیانت داری سے انجام دیتا۔ وہ اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے شب و روز محنت کرتا، یہاں تک کہ اسے گھر جانے کی مہلت نہ ملتی، اس کی بیوی اکثر کہتی۔

"گھر تو میرے بوڑھے شوہر کے لئے ایک ریلوے
اسٹیشن ہے۔ جہاں وہ کبھی کبھار آکر ٹھہرا کرتا ہے اور
تھوڑی دیر سستانے کے بعد فوراً روانہ ہو جاتا ہے۔"

وانگ چونکہ سب کی بھلائی کے لئے بڑی محنت کرتا تھا، اس لئے گاؤں والوں نے اسے بریگیڈ کی حیثیت سے منتخب کر لیا تھا اس کے ذمہ یہ کام اعزازی طور پر سونپ دیا گیا تھا کہ میٹنگ بلانے کے وقت اور صبح تڑکے گھنٹی بجایا کرے۔ گاؤں والوں کی طرف سے بوڑھے وانگ کے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

ایک صبح، خلاف معمول گھنٹی نہیں بجی، گاؤں والوں پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، ان کی زندگی کا یہ عجیب و غریب واقعہ تھا۔ بوڑھے، جوان، بچے اور عورتیں دیر تک گھنٹی کی آواز کے منتظر رہے مگر گھنٹی کی مخصوص، مانوس آواز سنائی نہ دی، زندگی کا ایک ربط کہیں گم ہو گیا تھا۔

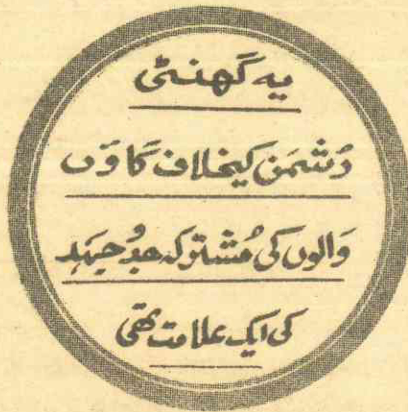
اس صبح کو جب بوڑھا وانگ گھنٹی بجانے کے لئے درخت کے قریب پہنچا تو اس کی نظریں درخت کے تنے پر چپکے ہوئے ایک بڑے پوسٹر پر پڑیں۔ اس پر بڑے بڑے الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔

"ہمارا بریگیڈ لیڈر، بوڑھا وانگ
ہر کام میں اپنی مرضی چلاتا ہے۔

وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر بے چوں چراں عمل
کیا جائے، اختلاف کرنے کا حق وہ کسی کو
نہیں دیتا —"

بریگیڈ لیڈر پوسٹر پڑھنے کے بعد شدید الجھن میں پڑ گیا اور اپنا فرض انجام دیئے بغیر سیدھے اپنے گھر چلا گیا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ موسم بہار کی فصل کی تیاری تیزی سے قریب آ رہی تھی۔

"جب تک بریگیڈ لیڈر اپنا فرض انجام نہیں دیتا۔ ہم میں سے کسی ایک کو یہ کام سنبھالنا ہو گا۔ اور گھنٹی بجا کر بوڑھے بریگیڈ لیڈر کو اس کے فرض کا احساس دلانا ہو گا۔" گاؤں کے ایک نوجوان نمائندے وی تنگ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ وی تنگ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ہم اپنے بریگیڈ لیڈر کو خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ وہ ایک ایماندار اور محنتی شخص ہے۔ اس کے کام میں کچھ خامیاں اور غلطیاں رہی ہیں۔ لیکن وہ اپنے ماضی میں جدوجہد کی ایک پوری تاریخ رکھتا ہے۔ اس نے دس سال کی عمر سے کام کرنا شروع کیا۔ اور اس دوران میں رات دن۔ بار



گھنٹی کی آواز اس گاؤں میں حرکت روشنی اور زندگی کی علامت بن چکی تھی

دھوپ میں مسلسل کام کرتا رہا۔ ہمارے کھیت کے چپے چپے میں اس کا پسینہ جذب ہے وہ طبقاتی جدوجہد اور پیداواری کاموں میں ہم لوگوں سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہے، وہ ہمارے لئے ایک خزانے سے کم نہیں ہے۔ اگر اس نے کچھ غلطیاں کی ہیں تو ہمیں موقع دینا چاہئے کہ وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کر لے۔"

گاؤں کے ایک اور نوجوان نمائندے نے کہا کہ "گزشتہ موسم بہار کے موقع پر جب دھان کا رنگ سبزی مائل ہونے لگا تو اچانک خشک سالی کا خطرہ بڑھ گیا تھا، ہمارا بوڑھا بریگیڈ سردی اور بخار میں مبتلا ہو گیا، مگر اس نے اپنی بیماری کی پرواہ نہ کی اور دن رات ہمارے ساتھ کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اُسے اٹھا کر گھر لے جایا گیا، اور اس کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا تاکہ وہ بھاگ نہ سکے، لیکن شام کے وقت وہ بیوی سے نظریں بچا کر بھاگ نکلا اور سیدھے فارم پر آ کر کام پر جُٹ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اجتماعی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔"

گاؤں کے ایک پوپلے منہ والے تنگ یوچی نے اپنی منڈیا ہلا کر کہا۔ "چند سال پیشتر سیلاب کی وجہ سے بند کا پُشتہ کمزور ہو گیا تھا۔ کسی بھی وقت پانی کے ایک زوردار ریلے سے وہ بہہ سکتا تھا۔ بوڑھا وانگ مسلسل تین دن اور تین راتیں اس جگہ بیٹھا رہا، اور اس دوران میں گاؤں والوں نے ایک نیا مضبوط پُشتہ تیار کر دیا۔"

گاؤں والے ایک ایک کر کے بوڑھے وانگ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے، جہاں وانگ کی خوبیوں کا ذکر کیا گیا وہیں اس کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی۔ اس تمام گفتگو کے بعد بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ "ہمیں بوڑھے وانگ کی خامیوں کی نشاندہی کرانے میں اس کی مدد کرنی چاہئے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر سکے۔ اور انقلابی جدوجہد اور پیداواری کاموں میں دوبارہ ہماری رہنمائی کر سکے۔"

شام ہوئی تو ان میں سے دو نمائندے بوڑھے وانگ سے ملنے کے لئے اس کے گھر گئے۔ مگر وہ گھر پر موجود نہ تھا، وہ بہت دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے مگر اس دوران بوڑھا وانگ واپس نہ آیا۔

بوڑھے وانگ کی بیوی نے بتایا کہ وہ پوسٹر کی عبارت پڑھنے کے لئے کئی بار درخت کے پاس گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے اندر ایک زبردست کشمکش جاری ہے۔"

نوجوان نمائندوں نے جب یہ سُنا تو وہ خوشی سے اُچھل پڑے، وہ سمجھ گئے کہ بوڑھا وانگ حقیقت کی تلاش میں ہے، وہ بڑی تیزی سے گاؤں کے آخری کنارے کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دیکھا، بوڑھا وانگ درخت کے قریب بُت بنا کھڑا ہے اور اس کی نظریں پوسٹر پر لگی ہیں۔ کوئی تنگ نے اپنی جیب سے ہاتھ نکال کر بڑی محبت سے بوڑھے وانگ کے شانوں پر رکھ دیا۔ بوڑھے وانگ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ گاؤں کے نوجوان اور پُرجوش نمائندوں کو اپنے قریب دیکھ کر اس کے چہرے پر تازگی اور بشاشت دوڑ گئی۔ تینوں ایک اونچی جگہ پر بیٹھ گئے۔

بوڑھے وانگ نے نمائندوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میں نے اس پوسٹر کو کئی بار پڑھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس پوسٹر کا حرف بہ حرف صحیح ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں میرے اندر کئی تبدیلیاں ہوئی ہیں میں لوگوں کی رائے سُننا گوارا نہیں کرتا تھا اور نہ ہی ان کی مخلصانہ تنقید برداشت کرتا، جس کی وجہ سے گاؤں والوں کو کئی بار بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ مثال کے طور پر گزشتہ سال گاؤں والوں نے بارش کی پیش گوئی کی تھی اور مجھے دھان کی چھٹائی میں چند دن توقف کرنے کا مشورہ دیا تھا، مگر میں نے ان کے مشورے پر عمل نہ کیا اور انہیں کام جاری رکھنے کی ہدایت کر دی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیشگوئی کے مطابق چند ہی دنوں کے بعد بارش ہوئی، اور آدھے سے زیادہ اناج بارش کی نذر ہو گیا۔"

بوڑھے وانگ نے یہ کہتے کہتے اپنی گردن جھکا لی۔

کوئی تنگ نے بوڑھے وانگ کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ "تم ہمارے بریگیڈ لیڈر ہو، تمہیں مصیبتوں اور پریشانیوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ تم نے گاؤں والوں کیلئے قیمتی خدمات انجام دی ہیں۔ تم نے دیکھ لیا کہ غلط فیصلہ کرنے سے آدمی، اکثریت سے کٹ کر تنہا رہ جاتا ہے۔" کوئی تنگ ایک لمحہ کے لئے رُکا، بوڑھا وانگ اس کی باتوں کو بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ "اس سے قبل، جب گھنٹی بجتی تھی تو گاؤں کے سبھی لوگ ایک دل اور ایک ذہن کے ساتھ اس بوڑھے کی قیادت میں چلتے تھے جس نے گاؤں والوں کی خوشحالی کیلئے بڑے دُکھ جھیلے تھے۔ آخر ایسا کیوں؟ اس لئے کہ ان دنوں تمہارا دل بھی دوسروں کے ساتھ دھڑکتا تھا، تم ان کی باتوں کو غور سے سُنتے تھے اور ان پر عمل بھی کرتے تھے۔"

"لڑکے، تمہاری باتیں بالکل ٹھیک ہیں"۔ بوڑھے وانگ نے اپنی خشخشی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔ اپنوں کی بے لاگ، صحیح اور مخلصانہ تنقید سے اس کا چہرہ خوشی سے کھِل اُٹھا تھا۔ "جس وقت بھی ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے ہمیں اس کی اصلاح کرنی چاہئے۔"

وہ تینوں ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھے ہوئے رات بھر باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی، مشرقی اُفق پر پھیلے ہوئے بادلوں کا رنگ سُرخ تھا اور وہ بڑی سُبک خرامی سے شمالی چین کے میدانوں کے اوپر سے گذر رہے تھے۔ بوڑھے وانگ نے لمحہ بھر کے لئے انہیں دیکھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ رات بھر جاگنے کے باوجود اس کے چہرے پر غنودگی یا تھکن کے آثار نہ تھے۔ وہ بڑے عزم کے ساتھ بوڑھے درخت کے قریب پہنچ گیا۔ اور زور زور سے گھنٹی بجانے لگا جو حرکت، روشنی اور زندگی کی علامت بن چکی تھی۔

گاؤں والوں نے جب گھنٹی کی آواز سُنی تو وہ خوشی سے چلّاتے، رقص کرتے ہوئے درخت کی جانب دوڑ پڑتے۔ سارا گاؤں ایک آواز سے چیخ رہا تھا۔ "ہمارا بوڑھا بریگیڈ لیڈر اپنے کام پر واپس آ گیا۔ وہ ہمارے لئے ہر روز گھنٹی بجائے گا۔ ہمارا بوڑھا بریگیڈ لیڈر وانگ۔"

بوڑھے وانگ نے دیکھا، گاؤں والوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ بوڑھے وانگ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اس نے پوری طاقت سے چلّا کر کہا۔ "نہیں، تم لوگوں نے بروقت گھنٹی بجا کر مجھے خبردار کر دیا۔۔۔ میں تم لوگوں کا مشکور ہوں۔"

ٹریڈ یونین پالیسی کیا ہونی چاہیے

محمد زبیر

مزدور تحریک کس طرح کچلی گئی!

گزشتہ ٹریڈ یونین تحریک اور آئندہ ٹریڈ یونین پالیسی کے بارے میں یہ جائزہ بحث کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ اس موضوع پر آپ کی رائے کا خیر مقدم کرے گا

ٹریڈ یونین کے قوانین اور پالیسی کیا ہونی چاہئیے تاکہ صنعتی امن بحال رہے۔ یہ سوال آج کل مزدور لیڈروں اور صنعت کاروں کے درمیان زیر بحث رہتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ صنعتی امن ہے کیا؟ صنعتی امن کی تعریف جب تک متعین نہیں ہوتی، ٹریڈ یونین کے قوانین اور صحیح لیبر پالیسی مرتب نہیں ہو سکتی۔

سب سے پہلے مزدوروں کے مسائل پر نظر ڈالئیے کیونکہ انہی مسائل کی بنا پر صنعتی امن کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ یہ مسائل درج ذیل ہیں۔

١ - تنخواہیں مہنگائی کے حساب سے مقرر نہیں ہوتیں۔

٢ - بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔

٣ - ملازمت کا تحفظ نہیں۔

٤ - ایک مزدور سے چار مزدوروں کا کام لینے کے باوجود ایک کی بھی پوری اجرت نہیں دی جاتی ہے۔

٥ - گریجویٹی، چھٹی اور بونس کے ناقص قوانین کا نفاذ، اور ان پر صحیح عمل درآمد نہیں ہوتا۔

٦ - مزدوروں سے ناروا سلوک۔

٧ - غیر ہنرمند مزدوروں کی تنخواہوں میں جس تناسب سے اضافہ کیا جاتا ہے، اسی تناسب سے نیم ہنرمند اور ہنرمند مزدوروں کی اجرتوں میں اضافہ نہیں کیا جاتا۔

٨ - رہائش کا سنگین مسئلہ۔ اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک وہ بے گھر ہیں، جو مستقل آبادکاری چاہتے ہیں اور جنہیں بالعموم "مہاجر" کہا جاتا ہے (اگرچہ ہر مہاجر بے خانماں نہیں) دوسرے روزگار کے سلسلے میں اپنا گھر در چھوڑ کر شہر میں آتے ہیں اور سر چھپانے کی جگہ نہیں پاتے۔ مزدوروں کی رہائش کے لئے مکانوں کی تعمیر بہرحال صنعت کار کی ذمہ داری ہے۔

٩ - مزدور، آزادانہ طور پر یونین بنانے کے حق سے محروم ہیں۔

یہ ہیں، مزدوروں کے چند مسائل جن کے حل کے لئے پالیسی اور قوانین مرتب ہونے چاہئیں۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ حکومت مزدور لیڈروں کو اعتماد میں لے کر مزدوروں کی تکالیف اور احساسات کو سمجھے۔ مزدور لیڈروں کے انتخاب میں، ان کے ماضی کو سامنے رکھنا ہوگا، تاکہ غلط آدمیوں پر اعتماد کرنے سے نقصان نہ ہو۔

صنعتی امن

اصل سرمایہ مزدور کی محنت ہے۔ صنعت کار یہ بات نہیں مانتا، وہ چاہتا ہے کہ ایک مزدور سے چار مزدوروں کا کام لے، ان کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرے اور کم سے کم اجرت دے اور اس معمول کو مستقلاً جاری رکھے، لیکن مزدور، اگر اس استحصال کے مقابلے میں متحد ہوں اور اپنی ٹریڈ یونین قائم کرنا چاہیں تو صنعتی امن خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ شدید محنت معمولی اجرت اور اس میں بڑے بڑے کنبے کی بمشکل کفالت، بڑھتی ہوئی بیروزگاری اور مہنگائی اور گھٹتی ہوئی سکے کی قیمت، یہ ساری باتیں مزدوروں کو متحد ہو کر اپنے مطالبات پیش کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

مزدور اپنی محنت کا جائز معاوضہ چاہتا ہے وہ سرمایہ داروں کے استحصال، ظلم اور ہوس کو روکتا ہے اور اسی کے خاتمہ کا نام مزدور کی اصطلاح میں صنعتی امن ہے۔

جہاں تک مطالبہ اور ہڑتال کا تعلق ہے یہ سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہیں۔ مطالبہ ہر طبقہ کرتا ہے صنعت کار حکومت سے اور مزدور آجر سے مطالبہ کرتا ہے۔ مگر صنعت کار کے مطالبہ کو حکومت صنعت یا ملک کی تباہی اور بربادی قرار نہیں دیتی۔ اس صورت میں مزدوروں کے مطالبے کو صنعتی امن یا ملک کی تباہی و بربادی کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ جب تک ملک میں طبقہ داری سماج قائم ہے محنت کرنے والے ہاتھ پیداوار کے وسائل کو مفت خور طبقوں کے ہاتھ سے واپس لینے کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

جہاں طبقہ داری سماج ختم ہو جاتا ہے وہاں احتجاج مطالبے اور ہڑتال کا عمل بھی از خود ختم ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹ ملکوں میں جہاں محنت کے وسائل براہ راست مزدوروں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، انہیں ہڑتال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

ماضی میں ہمیں نوکرشاہی اور مزدور لیڈر دونوں کا گٹھ جوڑ دکھائی دیتا ہے، لیکن صحیح لیبر قوانین کے لئے حکومت کو ایسے لیڈروں پر اعتماد کرنا ہوگا جو نوکرشاہی کے نہیں بلکہ مزدوروں کے دوست ہوں برطانوی سامراج نے برصغیر سے رخصت ہوتے وقت اقتدار کی باگ ڈور اُن طبقوں کے ہاتھ میں سونپ دی تھی جو اس کے مفادات کی حفاظت کر سکیں چنانچہ نوکرشاہی حکومت پر قابض رہی اور سامراجیوں اور کاروباری مفادات کی بدستور حفاظت کرتی رہی، سامراج کے منصوبے اور پروگرام کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ چونکہ مزدور اور محنت کش عوام تھے اس لئے مزدوروں کو غیر منظم رکھنے کی پالیسی مرتب ہوئی، مزدور انجمنوں کی نمائندہ تنظیم "پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن" کو ختم کر دیا گیا۔ اس کے دفتروں کو سیل کیا گیا۔ اور اس کے جنرل

سیکرٹری ڈاکٹر عبدالمالک وزیر محنت بن گئے، البتہ دوسرے مزدور رہنما جنہیں نوکر شاہی کی اطاعت پسند نہ تھی وہ جیلوں کو سدھار رہے۔ وہ مزدور قوانین جو سخت جدوجہد کے بعد مزدوروں کو دورِ غلامی میں حاصل ہوئے تھے انہیں بھی ختم کر دیا گیا تاکہ اس نئی محکومی کے خلاف مزدوروں کی آواز نہ اُٹھ سکے۔

سامراجی منصوبے اور پروگرام کے تحت جہاں ٹریڈ یونین تحریک ختم کرنے کی پالیسی اور قانون وضع کئے گئے ہیں، مزدور لیڈروں کی خرید و فروخت شروع ہوئی، بنگلہ، کار، اچھی ملازمت اور سامراجی ممالک میں ان کے لئے سیر و تفریح کا بندوبست کیا گیا۔ باشعور مزدور کارکنوں اور ان کے لیڈروں کی شہری آزادی سلب کر لی گئی۔ سیکیورٹی ایکٹ جیسے قوانین کے تحت انہیں جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ ملک دشمنی کا الزام لگا کر انہیں مزدوروں اور عام لوگوں میں بدنام کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ نوکر شاہی نے صنعت کار اور محکمۂ محنت کے اشتراک سے مزدوروں پر خود ساختہ مزدور لیڈر مسلط کرنے کا پروگرام بنایا۔ جن کا نام مزدور مسائل حل کرنے کی بجائے انہیں لیت و لعل میں ڈالنا اور اُلجھانا تھا۔

نئے مزدور لیڈروں کی آمد

مزدور کو باشعور اور متحد ہونے اور اپنے حقوق کے حصول سے روکنے کے لئے مزدور اسکول کا ایک نظام قائم کیا گیا۔ ٹریڈ یونین کو دفتروں اور فائلوں میں محصور کر دیا گیا۔ اب عدالتوں کے پھیرے لگوائے جانے لگے۔ اور اس کام کے اُستادوں کی لمبی لمبی تنخواہیں مقرر ہونے لگیں (اتنی بھاری رقم کہاں سے آتی رہی) یہ کسے معلوم؟ مزدور جب بھی ذرا بیدار ہوتے تو مزدور لیڈر صنعت کار اور محکمۂ محنت کی ملی بھگت سے کارخانے میں ہڑتال کروا دیتا۔ یہ ہڑتال اتنی لمبی ہوتی کہ مزدور مایوس ہو کر اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے، باشعور مزدور جیل میں ہوتے۔ بعضوں کی ملازمت ختم کر دی جاتی۔ صنعت کار کو کچھ دنوں کے لئے اطمینان نصیب ہو جاتا۔ مزدور لیڈر پھر بھی مزدور لیڈر رہتا۔ چین کی بانسری بجاتا اور عیش و عشرت کی زندگی گذارتا۔

جہاں تک ۵۲ - ۱۹۵۳ء کے بعد کے دَور کا تعلق ہے، مزدور لیڈر صنعت کاروں کے قابلِ اعتماد ساتھی ثابت ہوئے، وہ صنعت کاروں کی پالیسی پر صاد کرتے رہے ہیں۔ اس دَور میں جتنے مزدور لیڈر منظرِ عام پر آئے، اخبارات نے جن کے نام کی بڑی بڑی سُرخیاں لگائیں انہوں نے اپنی ذاتی منفعت کو مقدم جانا۔ ٹریڈ یونین کو ایک آسان ذریعہ معاش سمجھا، ورنہ کیا وجہ ہے کہ ملک میں مزدوروں کی کوئی نمائندہ مزدور تنظیم نہ بن سکی۔ (مزدور لیڈروں کے کاغذی ہونے کا ثبوت ۶۳ء کی عام ہڑتال اور ۶۹ء کی منگھوپیر کی ہڑتال ہے) یونین سے زیادہ فیڈریشن بن گئے۔ ہر صنعت میں دو تین رجسٹرڈ یونین نظر آنے لگیں۔ یونین کا فنڈ مالکان خود وضع کرتے لگے۔

تاکہ اُن کی مرضی کے بغیر کوئی ٹریڈ یونین کام کے قابل ہی نہ رہ سکے۔

لیکن نوکر شاہی کے ساختہ مزدور لیڈر بدنام ہو کر اپنی موت آپ مرنے لگے تو سامراج نے دوسرا پینترا بدلا، ٹریڈ یونین کے اسکول کا نظام ترک کر دیا گیا۔ اُستاد لوگ کدھر گئے، اب اُن کی ذات ایک پہیلی بن چکی ہے۔ سامراج کے نئے منصوبے اور پروگرام کے تحت اب ان کی جگہ "نئی" "لیڈر شپ" پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ نئے لیڈر مزدور مسائل سے بے تعلق رہ کر، بلکہ انہیں پسِ پشت ڈال کر اسلام اور نظریۂ پاکستان کی بات کرتے ہیں۔ اسلام کے نام کی مزدور تنظیمیں قائم کی جا رہی ہیں۔ بڑے بڑے عالیشان دفتر کھولے گئے ہیں۔ اسلام کے نام کی ٹریڈ یونین بھی عجیب مضحکہ خیز چیز ہے کہ آجر اور مزدور دونوں ہی مسلمان ہوتے ہیں اور اسلام ان کے درمیان کوئی نزاعی معاملہ نہیں ہوتا۔

ان نام نہاد اسلام پسندوں کی طرح ایک گروہ نظریہ پرستوں کا بھی وجود میں آچکا ہے۔ یا لایا گیا ہے جو سوشلزم کا نام لے کر سوشلزم کا مخالفت کرتا ہے جو مزدور مسائل سے لاتعلق ہے مگر ترمیم پسندی کے خلاف پر بہت زور دیتا ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کہ نظریہ کیا ہے، جس طرح اسلام پسند نہیں جانتا کہ اسلام کیا ہے سوائے اس کے کہ مالکان کو من مانی کرنے کی آزادی رہے اور مزدور اور عوام غیر منظم رہیں۔ نظریہ پرست مزدور لیڈر بھی عام زندگی میں ان نام نہاد اسلام پسند مزدور لیڈروں کی طرح نظر آتا ہے کہ وہ بھی عیش و عشرت کی زندگی گزارتے آئے ہیں اور یہ بھی —

ایک اور گروہ جو خال خال نظر آتا ہے، وہ مزدوروں کو سیاست سکھانے کے وعدے پر مزدوروں کو دولتمند سیاسی لیڈروں کا آلۂ کار بنانا چاہتا ہے۔ جنکی سیاست صرف اپنے جلسوں کو کامیاب بنانے تک محدود ہے۔ وہ مزدوروں کو باشعور مزدوروں اور دانشوروں سے بھی الگ رکھنا چاہتا ہے۔ حالانکہ مزدوروں کی اپنی سیاست ہے یعنی روٹی، روزگار کے حصول اور اپنی محنت کا جائز ثمرہ حاصل کرنے کی سیاست۔

سامراج اور نوکر شاہی کی سازش

سامراج کی سازش کے تحت نوکر شاہی کے عمل دخل سے جہاں مزدوروں کو نقصان پہنچا ہے، وہاں حکومت کے لئے بھی دردِ سری پیدا ہوتی رہی ہے۔ ملک بھر کا استحصال ہو رہا ہے، (ریلوے اور نہروں کے سُود وصولی اور غیر ملکی کمپنیوں کی نفع اندوزی) پاکستان میں کوئی بنیادی صنعت قائم نہیں ہو سکی ہے۔ بے روزگاری اور مہنگائی کا حل تلاش نہیں ہو سکا ہے۔ معمولی کام کے لئے بھی دوسرے ملکوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ صنعت کاروں کا بھی نقصان ہوا ہے جو بیرونی تجارت میں اینگلو امریکی سامراج کی محکومی کے باعث آزادانہ تجارت

کے قابل نہیں ہو سکتے ہیں۔ اب صنعت کاروں کو بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے یہاں نمائندہ مزدور یونین اور لیڈر نہیں ہیں جن سے بات چیت کر کے مسئلہ کو سلجھایا جا سکے۔

یہ ہے پاکستان میں ٹریڈ یونین تحریک کے زوال کا ایک سرسری سا جائزہ۔ اب ہمیں ماضی سے سبق حاصل کرنا ہے۔ ماضی کی خرابیوں کو ترک کرنے کی جدوجہد کرنی ہے۔ اور مستقبل کے لئے غور و فکر کرنا ہے کہ نمائندہ ٹریڈ یونین تحریک قائم ہو سکے۔ اسکے بغیر مزدوروں کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

مستقبل کی لیبر پالیسی کے نکات!

مزدور قوانین اور لیبر پالیسی مرتب کرنے کے لئے مزدور لیڈروں کو اعتماد میں لینا ضروری ہے مگر ہم یہ تسلیم کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے کہ اس وقت پاکستان میں نمائندہ ٹریڈ یونین اور لیڈر نہیں ہیں۔ اس لئے موجودہ مزدور لیڈروں کے ساتھ ساتھ ان مزدور لیڈروں کو بھی اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ (خواہ ان کا تعلق کسی ٹریڈ یونین سے ہو یا نہ ہو) جنہیں سابقہ حکومت نے تشدد کے ذریعہ مزدور تنظیم سے الگ کر دیا تھا۔ یا انہیں خاموش ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ تحریک کی سابقہ تلخیوں اور آزاد ٹریڈ یونین تحریک کے مطالبوں سے وہی لوگ بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔

مزدوروں کی نمائندہ ٹریڈ یونین کے قیام کے لئے درج ذیل امور پر غور کرنا ہوگا۔ ورنہ مزدوروں کے کوئی مسائل حل نہ ہو سکیں گے اور مزدور بدستور مالکان اور نوکر شاہی کے رحم و کرم پر رہیں گے۔

(۱) (الف) مکمل ٹریڈ یونین ایکٹ ۲۶ء کا دوبارہ نفاذ۔
(ب) مزدور قوانین اور پالیسی کی جانچ پڑتال کے لئے مزدور لیڈروں پر مشتمل ایک کمیٹی کا قیام۔
(۲) لیبر ڈپارٹمنٹ کو مکمل طور سے غیر جانبدار رکھنے کی پالیسی پر عمل۔
(۳) مکمل جمہوریت کی بحالی، پریس کی مکمل آزادی اور پریس ٹرسٹ کا خاتمہ۔
(۴) سینٹو اور سیٹو جیسے معاہدوں سے علیحدگی (جب تک یہ نہ ہوگا نوکر شاہی کی بالادستی قائم رہے گی)
(۵) مزدور یونین کے انتخابات کے لئے خفیہ رائے شماری کی بجائے حاضر ممبروں کی رائے کا اصول تسلیم کیا جائے۔
(۶) مزدوروں اور مزدور لیڈروں کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے سلسلے میں قید یا جرمانے کی سزائیں یا شہر بدر کرنے کی سزا نہ دی جائے۔
(۷) مزدوروں پر لیڈر مسلط کرنے کی پالیسی ترک کی جائے۔
(۸) امتناعی نظر بندی کے تمام قوانین منسوخ کئے جائیں۔
(۹) آزادانہ ٹریڈ یونین بنانے کا حق تسلیم کیا جائے۔

مکتوب ڈھاکہ : احمد الیاس

طلبا نے عوامی بیداری اور ۱۱ نکات کا ہفتہ منایا

اتحاد کو لات مارو اور بنگال کو آزاد کرو

انتہا پسند نوجوانوں کا نعرہ



یوم اسد شہید کے موقع پر پلٹن میدان میں عوامی نغمے پیش کئے جا رہے ہیں

۱۷ جنوری سے ۲۴ جنوری تک مشرقی پاکستان میں "عوامی بیداری" اور "گیارہ نکات" کا ہفتہ منایا گیا۔ پچھلے سال کے برعکس طلبا کی مختلف انجمنوں اور مزدور تنظیموں نے اس سال شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے الگ الگ پروگرام مرتب کئے۔ گذشتہ سال اسی ۲۴ جنوری کو ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ولی نواز طلبا یونین مطیعہ گروپ، نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (محبوب الحق دولن گروپ) اور عوامی لیگ کی حامی طلبا تنظیم چھاترو لیگ سے بغاوت کر کے الگ ہو جانے والی طلبا تنظیم "بنگلہ چھاترو لیگ" نے مشترکہ طور پر اپنا جلسہ منعقد کیا تھا۔ چھاترو لیگ نے گذشتہ سال ۲۵ جنوری کو پلٹن میدان میں جلسہ کیا تھا۔ ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان طلبا کی صفوں میں جو انتشار پیدا ہوا اس نے ۱۹۷۱ میں مزید شدت اختیار کر لی۔ اور اس انتشار نے اب مشرقی پاکستان میں دائیں اور بائیں بازو کے سیاسی تضادات کو بہت نمایاں کر دیا ہے

طلبا پاکستان کی سیاست میں سب سے زیادہ باشعور طبقے کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ طلبا کے فیصلوں اور ان کی تحریکوں نے ہماری قومی سیاست کا رخ موڑا ہے اور طلبا کی عظیم قربانیوں کے سبب ہم نے استحصالی نظام کے خلاف جدوجہد کے کئی مرحلے طے کئے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں طلبا کو سیاست میں جو اہم مقام حاصل ہے اب اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم صرف اس صورت حال کو قارئین کرام کے سامنے لانا چاہتے ہیں جو گذشتہ دو سال کے دوران طلبا کی تحریکوں کے نتیجے میں اُجاگر ہوئی ہے اور جس کے بارے میں ہم یہ پیشین گوئی کرتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے کہ اس صورت حال سے ہماری قومی سیاست کا ایک بار اور متاثر ہونا ناگزیر ہے۔

۱۷ جنوری ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں طلبا کی ایک مجلس نے گیارہ نکاتی پروگرام مرتب کیا۔ یہ مجلس بعد میں SAC یعنی اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی (طلبا کی مجلس عمل) کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ گیارہ نکاتی پروگرام حسب ذیل ہے۔

(الف) مالی اعتبار سے مستحکم کالجوں کو صوبائی درجہ دینے کی پالیسی ترک کر دینی چاہئے صوبائی درجہ دیتے ہوئے کالجوں کو بشمول جگنا تھ کالج ڈھاکہ سابقہ حیثیت بھی دی جائے۔

(ب) تعلیم و تدریس کو عام کرنے کی غرض سے صوبے بھر میں کالج اور اسکول کھولے جائیں۔ اور خصوصی طور پر دیہاتی علاقوں میں پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں کو بغیر کسی تاخیر کے سرکاری منظوری دی جائے۔ اس کے علاوہ ٹکنیکل تعلیم کو عام کرنے کے لئے ضروری پیمانے پر انجنیرنگ، پالی ٹکنیک، ٹکنیکل اور کمرشیل کالج کھولے جائیں

(ج) صوبے کے تمام کالجوں میں آئی اے، آئی ایس سی اور آئی کام کی پڑھائی کے لئے نائٹ شفٹ کا انتظام کیا جائے اور مستحکم کالجوں میں رات کے وقت بی اے، بی ایس سی اور بی کام کی پڑھائی کا انتظام کیا جائے اور صوبائی کالجوں میں رات کو دوسری شفٹ میں ایم اے، ایم کام اور ایم ایس سی کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا جائے۔

(د) ٹیوشن فیس میں ۵۰ فیصد تخفیف کی جائے۔ اسکالرشپ اور وظیفہ میں اضافہ کیا جائے۔ اور طلبا کو اپنی تحریک میں حصہ لینے کی بناء پر مراعات سے محروم نہ کیا جائے۔

(ہ) اقامتی ہوسٹلوں اور ہالوں کے کھانے اور کینٹینوں کے اخراجات کا ۵۰ فیصد حصہ حکومت ادا کرے۔

(و) اقامتی ہال اور ہوسٹلوں کے مسائل حل کئے جائیں۔

(ز) تعلیم کے تمام مراحل میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور بنگلہ زبان کو تمام دفتری، تجارتی اور سرکاری سطح پر رائج کیا جائے۔

(ح) تمام تعلیمی اداروں میں تجربہ کار اور تربیت یافتہ اساتذہ کافی تعداد میں مہیا کئے جائیں اور اظہار فکر و خیال کی آزادی کی ضمانت دی جائے

(ط) آٹھویں درجے تک مفت لازمی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور تعلیم نسواں کو توسیع و ترقی دی جائے۔

(ی) میڈیکل یونیورسٹی قائم کی جائے۔ آٹومیشن کو منسوخ کیا جائے۔ نامزدگی کے ذریعہ داخلہ بند کیا جائے۔ میڈیکل کونسل آرڈیننس واپس لیا جائے۔ ڈنٹل کالج کو ایک مکمل کالج کا درجہ دیا جائے اور میڈیکل طلبا کے تمام مطالبات تسلیم کئے جائیں اور نرس طالبات کے مسائل بھی حل کئے جائیں۔

(ک) انجنیرنگ یونیورسٹی کے طلبا کے مطالبات جن میں آٹومیشن کی منسوخی، رنٹل لائبریری کا بہتر انتظام اور انجنیرنگ کے آخری سال میں کلاسوں کا انتظام شامل ہے پورے کئے جائیں۔

(ل) پالی ٹکنیک کے طلبا کو کنڈنس کورس کی سہولت دی جائے ڈپلوما سمسٹر امتحان کی بنیاد پر دیا جائے اور بورڈ کے فائنل امتحان کے موجودہ قاعدے کو منسوخ کیا جائے۔ ٹکسٹائل ٹکنولوجی، سرامک ٹکنولوجی، لیدر ٹکنولوجی اور آرٹس کالج کے طلبا کے مطالبات منظور کئے جائیں۔

(م) زرعی یونیورسٹی اور زرعی کالج کے طلبا کے جائز اور ضروری مطالبات تسلیم کئے جائیں۔ زرعی کالج کے طلبا کے مطالبات جن میں ڈپلوما کورس کے لئے کنڈنس کورس کا مطالبہ بھی شامل ہے منظور کیا جائے۔

(ن) طلبا کو شناختی کارڈوں کی بنیاد پر ریل کے کرائے میں

بحری فوج کا ہیڈکوارٹر مشرقی پاکستان لایا جائے: طلباء کا مطالبہ

۵۰ فیصد رعایت دی جائے۔ اور یہی مراعات ریل کے ماہانہ ٹکٹوں کے لئے بھی برقرار رکھی جائیں۔ مغربی پاکستان کی طرح اس صوبے میں بھی طلبا کو بسوں کے کرائے کی مراعات دی جائیں۔ اندرونِ شہر ایک مقام سے دوسرے مقام تک کرایہ دس پیسے ہو اور بیرونِ شہر کرائے میں ۵۰ فیصد رعایت دی جائے۔ طالبات کے لئے اسکولوں اور کالجوں تک آنے جانے کی غرض سے کافی بسوں کا انتظام کیا جائے۔ سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی طرف سے منعقد کئے جانے والے کھیلوں کے مقابلوں اور تفریحی و ثقافتی تقریبات میں شرکت کے لئے طلبا کو ٹکٹوں میں ۵۰ فیصد رعایت دی جائے۔

(س) طلبا کو ملازمت کی سہولت کی ضمانت دی جائے۔

(ع) معتوب شدہ یونیورسٹی آرڈیننس کو باطل قرار دیا جائے اور تعلیمی اداروں کے لئے جن میں یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں مکمل خودمختاری کی ضمانت دی جائے۔

(ف) تعلیمی پالیسی پر پابندی لگانے والے تمام قواعد و ضوابط قومی تعلیمی کمیشن رپورٹ اور حمود الرحمٰن رپورٹ کو باطل قرار دیا جائے طلبا اور عوام کی بھلائی کے پیشِ نظر ایک ایسا تعلیمی نظام قائم کیا جائے۔ جو سائنسی اور عوامی مفاد پر مبنی ہو۔

۲۔ حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ملک میں پارلیمانی جمہوری نظام قائم کیا جائے۔ اظہار کی آزادی، انفرادی آزادی اور اخبارات کی آزادی برقرار رکھی جائے اور روزنامہ اتفاق پر سے پابندی اٹھالی جائے۔

۳۔ مشرقی پاکستان کو مندرجہ ذیل نکات کی بنیاد پر مکمل علاقائی خودمختاری دی جائے

(الف) ملکی انتظامیہ کی بنیاد فیڈریشن پر ہو اور قانون ساز اسمبلیاں خودمختار ہوں۔

(ب) فیڈرل (مرکزی) حکومت کے ماتحت دفاع، امورِ خارجہ اور کرنسی ہوں۔ اور دوسرے تمام معاملات میں صوبوں کو مکمل اختیارات حاصل ہوں۔

(ج) ہر صوبے کے لئے ایک ہی کرنسی ہوگی لیکن کرنسی کا انتظام فیڈرل حکومت کے تحت ہوگا۔ اس طرح کرنسی کی حیثیت مرکزی ہو گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آئین میں واضح اور مکمل طور پر مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو کرنسی کی منتقلی پر پابندی لگائی جائے۔ اس کے مطابق پاکستان میں ایک فیڈرل ریزرو بینک ہو اور دونوں حصوں میں ایک ایک ریزرو بینک کام کریں گے اور مشرقی پاکستان کے لئے ایک الگ مالی پالیسی وضع کی جائے۔

(د) مال گذاری ٹیکس اور لگان عائد کرنے اور وصول کرنے کا اختیار صوبائی حکومتوں کو فیڈرل حکومت کو کوئی ٹیکس لگانے کا اختیار حاصل نہ رہے صوبائی حکومتوں کے وصول کئے ہوئے ٹیکس اور لگان کی رقم سے ایک طے شدہ حصہ مرکزی میں خزانہ میں جمع کیا جائے۔ ریزرو بینک سے متعلق تمام نکات آئین میں درج ہوں۔

(ہ) فیڈریشن کی ہر ریاست بیرونی تجارت اور اس کی آمدنی کا الگ الگ حساب کتاب رکھے گی اور بیرونی تجارت سے حاصل کیا ہوا زرمبادلہ ہر ریاست کی اپنی تحویل میں ہوگا۔ فیڈرل حکومت کے زرمبادلہ کی ضرورت ہر ریاست مساوی طور پر یا آئین میں درج نکات کے مطابق پوری کرے گی۔ ان سامانوں پر جو ملک کے ایک ریاست میں بنائے جائیں گے ان کا ایک ریاست سے دوسری ریاست کے درمیان لین دین ہوگا اور ان پر کسی قسم کی ڈیوٹی نہیں ہوگی۔ آئین میں اس بات کی بھی وضاحت ہو کہ دونوں حصے غیر ممالک سے تجارتی معاہدے اور درآمدی برآمدی تجارت کر سکتے ہیں اور تجارتی وفد بھیج سکتے ہیں۔ آئینی طور پر ہر ریاست کو درآمد کا حق دیا جائے۔

اسلحہ ساز کارخانہ قائم کیا جائے

۳۔ مشرقی پاکستان کی ملیشیا فوج یا پیراملٹری فوج قائم کرنے کا اختیار دیا جائے۔ مشرقی پاکستان میں اسلحہ ساز کارخانہ قائم کیا جائے اور بحری فوج کا ہیڈکوارٹر مشرقی پاکستان لایا جائے۔

۴۔ مغربی پاکستان کے سابق صوبوں کو جن میں بلوچستان، صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ شامل ہیں۔ صوبائی خودمختاری دے کر وہاں ایک ذیلی فیڈریشن قائم کیا جائے۔

۵۔ بینک انشورنس کمپنیوں اور جوٹ کی تجارت سمیت تمام بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔

۶۔ کسانوں پر لگائی جانے والی مالگذاری اور لگان کی شرح میں کمی کی جائے۔ کسانوں کے بقایاجات اور مالگذاری معاف کر دیئے جائیں۔ سرٹیفکیٹ سسٹم کو منسوخ کیا جائے۔ لگان وصول کرنے والے تحصیلداروں کی سختیاں روکی جائیں۔ جوٹ کی قیمت کم از کم فی من چالیس روپے مقرر کی جائے اور گنے کی معقول قیمت کی ضمانت دی جائے

(۷) مزدوروں کو واجب اجرت اور بونس دیئے جائیں ان کو تعلیمی، طبی اور رہائشی سہولتیں دی جائیں، مزدور دشمن کالے قوانین منسوخ کئے جائیں۔ مزدوروں کو ہڑتال کا حق دیا جائے اور یونین بنانے کا حق دیا جائے۔

۸:۔ مشرقی پاکستان میں سیلاب کی روک تھام اور تمام آبی ذرائع کے استعمال کا بہتر انتظام کیا جائے۔

(۹) تمام ہنگامی قوانین، سیکورٹی ایکٹ اور دوسرے امتناعی احکامات اٹھالئے جائیں۔

(۱۰) پاکستان کو سیٹو، سنٹو اور پاک امریکی فوجی معاہدوں سے الگ کیا جائے اور سیاسی بلاکوں سے نکل کر ایک آزاد خارجہ پالیسی مرتب کی جائے۔

(۱۱) تمام گرفتار شدہ طلبا، کسان، سیاسی کارکن اور سیاسی رہنماؤں کو فوراً رہا کیا جائے۔ اور تمام پروانہ ہائے گرفتاری سیاسی مقدمے بشمول مقدمہ اگرتلہ سازش اٹھالئے جائیں یہ تھے وہ گیارہ نکات جو ۷ جنوری ۱۹۶۹ء کو طلبا کی مجلس عمل نے عوام کے سامنے پیش کیا تھا۔ طلبا کی مجلس عمل میں جو تنظیمیں شامل تھیں ان میں عوامی لیگ کی حامی الیسٹ پاکستان چھاترو لیگ، بھاشانی نواز الیسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس یونین، ولی نواز الیسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس یونین کے علاوہ این ایس ایف بھی تھی جو اس وقت پیپلز پارٹی کی طرف مائل تھی۔ گیارہ نکاتی پروگرام پر دستخط کرنے والوں میں درج ذیل طالبعلم شامل تھے۔

طفیل احمد	نائب صدر	ڈھاکہ یونیورسٹی سنٹرل اسٹوڈنٹس یونین		
ناظم کامران چودھری	معتمد عمومی	〃	〃 〃	〃
مصطفیٰ جمال حیدر	صدر	مشرقی پاکستان	اسٹوڈنٹس یونین	(بھاشانی نواز)
محبوب اللہ	معتمد عمومی	〃	〃	〃
عبدالرؤف	صدر	〃	چھاترو لیگ	(عوامی لیگ)
خالد محمد علی	معتمد عمومی	〃	〃	〃
سیف الدین مانک	صدر	〃	اسٹوڈنٹس یونین	(ولی نواز)
شمس الضحیٰ	معتمد عمومی	〃	〃 〃	〃
ابراہیم خلیل	صدر	〃	نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن۔	
فخرالسلام	معتمد عمومی	〃	〃	〃 〃

ان طالب علموں میں سے ناظم کامرانی چودھری، ابراہیم خلیل اور فخرالاسلام طلبا کی سیاست سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ طفیل احمد، خالد محمد علی اب قومی اسمبلی کے ممبر بن چکے ہیں۔ محبوب اللہ جیل میں ہیں جمال حیدر کے نام پر لا تعداد گرفتاری جاری ہے سیف الدین مانک اب مزدور لیڈر ہیں۔

جنوری ۱۹۶۹ء میں اس گیارہ نکات کی تحریک نے اس وقت زور پکڑا جب قانون کے طالب علم اور بائیں بازو کے ایک سرگرم طالب علم رہنما اسدالزمان ۲۱۔ جنوری کو پولیس کی گولی سے شہید ہو گئے۔ اس سانحہ پر طلبا کی مجلس عمل نے ۲۴۔ جنوری کو عام ہڑتال کی اپیل کی اور اسی ۲۴ جنوری کو ڈھاکہ میں پریس ٹرسٹ کی عمارت میں آگ لگا دی گئی سیکریٹریٹ پر حملہ ہوا اور ایک مسلم لیگی ایم این اے کی رہائش گاہ نذر آتش کر دی گئی۔ آگ اور خون کے اس سیلاب میں طلبا کی تحریک پروان چڑھتی گئی اور بالآخر ایوبی آمریت کو اس تحریک کے آگے سرنگوں ہو جانا پڑا۔

ایوبی آمریت کے خاتمے کے بعد طلبا کی گیارہ نکاتی تحریک بھی سرد پڑ گئی اور اس کی جگہ ۶ نکات اور جے بنگلہ کے نعرے گونجنے لگے۔ لیکن اب جب کہ انتخابات مکمل ہو چکے ہیں اور مشرقی پاکستان میں چھ نکات اور جے بنگلہ کے نعروں کے ذریعے عوامی لیگ نے اس انتخابات میں تاریخی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ طلبا نے ایک بار پھر مشرقی پاکستان کی سیاست میں سر اٹھا رکھا ہے۔

۱۷ جنوری سے ۲۴ جنوری تک اس سال جس طور پر دائیں اور بائیں بازو کے طلبا نے یوم اسد، یوم عوامی بیداری اور ہفتہ گیارہ نکات منایا ہے وہ خاص طور پر مغربی پاکستان کے بائیں بازو کے سیاستدانوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ کیونکہ اس بار گیارہ نکاتی ہفتے کے دوران نہ صرف یہ کہ قومیت کے انتہا پسندانہ نعرے بلند ہوئے ہیں بلکہ پلٹن میدان سے بنگال کی مکمل آزادی کے لئے بھی آواز اُبھری ہے۔ یہ آواز اور یہ نعرے گرچہ اس وقت دائیں اور بائیں بازو کے سیاسی نظریات کے درمیان کشمکش کو نمایاں کر رہے ہیں لیکن وہ وقت اب قریب آ پہنچا ہے کہ جب ایک نظریے پر دوسرے کو برتری حاصل ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ نازک وقت مغربی پاکستان میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے افراد و سیاستدانوں کے لئے سخت آزمائش ہے! انھوں نے اگر مشرقی پاکستان میں طلباء کی موجودہ سیاست، ان کے فکری اور نظریاتی تضادات اور ان کے نئے نعروں کا تجزیہ کرنے میں ذرا بھی چوک کی تو ہم نہیں سمجھتے کہ مستقبل میں اس کے کیا نتائج سامنے آئیں گے۔

اس وقت اسٹوڈنٹس یونین ولی نواز گروپ کو چھوڑ کر طلباء کی دوسری تنظیمیں جن میں بھاشانی نواز اور مجیب نواز تنظیمیں شامل ہیں۔ آزادی کا نعرہ بلند کر رہی ہیں۔ یوم اسد کے موقع پر بائیں بازو کی طلباء یونین کے زیر اہتمام پلٹن میدان میں جو جلسۂ عام ہوا اور جس کے خاص مقرر مصطفےٰ جمال حیدر تھے (جو سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر پولیس کو مطلوب بھی ہیں) یہ نعرہ لگایا گیا "کسانوں، مزدوروں ہتھیار اُٹھاؤ اور پوربو بنگلہ کو آزاد کراؤ"۔ اس جلسۂ عام میں مصطفےٰ جمال حیدر نے بائیں بازو کے اتحاد پر زور دیتے ہوئے کہا: جو لوگ انتخاب میں کامیاب ہوئے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ ایک سال کے اندر بے نقاب ہو جائیں گے۔ اور اُس وقت یہ ثابت ہو جائے گا کہ طلبا نے گیارہ نکات کی بنیاد پر جو انقلابی تحریک چلائی تھی وہ صحیح تھی۔ مصطفےٰ جمال حیدر نے شیخ مجیب کی "بانس کی لاٹھی" کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ عوام نے بانس کی لاٹھی ضرور تیار کی ہے مگر یہ لاٹھی عوام دوستوں کے لئے نہیں بلکہ ان اقتدار پرستوں کے لئے ہے جنہوں نے ان سے بڑے بڑے وعدے کئے ہیں۔ مصطفےٰ جمال حیدر نے گیارہ نکاتی تحریک کو آزادی کی تحریک قرار دیتے ہوئے کہا کہ دُنیا کی تاریخ میں جب کبھی آزادی کی تحریک لکھی جائے گی بنگال کے عوام کا نام سُنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔ بائیں بازو کے طالب علموں کے بعد ۲۴ جنوری کو عوامی لیگ کی حامی تنظیم چھاترو لیگ نے یوم عوامی بیداری منایا۔ اس جلسے میں چھاترو لیگ کے تضادات بھی کھل کر سامنے آ گئے جب نور عالم صدیقی گروپ اور عبدالرب گروپ نے انتہا پسندانہ نعروں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ نور عالم صدیقی کے گروپ نے شیخ مجیب کے پیغام کو "جمہوری سوشلزم" قرار دیا لیکن عبدالرب گروپ نے نعرہ لگایا کہ "شیخ مجیب کا پیغام صرف سوشلزم ہے" اس دوسرے گروپ نے یہ بھی نعرہ لگایا کہ "اتحاد میں لات مارو بنگال کو آزاد کرو" پہلے گروپ نے نعرہ لگایا کہ جمہوری انقلاب زندہ باد اس کے جواب میں دوسرے گروپ نے کہا کہ آزادی کی جد و جہد زندہ باد اور مسلح انقلاب زندہ باد۔

مجیب اور بھٹو سے صدر یحییٰ کی ملاقاتوں پر اسلام پسند خفا ہو گئے

مکتوب پشاور

فارغ بخاری

صدر یحییٰ کا شیخ مجیب سے ملنے کے لئے ڈھاکہ جانا اور مسٹر بھٹو سے ملاقات کرنے لاڑکانہ جا کر المرتضیٰ میں قیام کرنا اسلام پسندوں کو ناگوار گذر رہا ہے۔ جس کا اظہار وہ اپنی صحبتوں میں برملا کر رہے ہیں۔ جمہوریت کے یہ نام نہاد دعویدار اپنی شکست کے بعد ملک میں مستقل طور پر مارشل لاء کے نفاذ کا جو خواب دیکھ رہے تھے، وہ شرمندہ تعبیر نظر نہ آیا، تو ان کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ صدر کی یہ عالی ظرفی انہیں ایک آنکھ نہ بھائی اور یہ چہ میگوئیاں کرنے لگیں کہ مجیب اور بھٹو کے پاس خود چل کر جانا صدر کے وقار کے منافی ہے وہ انہیں ایوان صدر میں بلا کر بات چیت کرتے۔ دراصل انہیں صدر سے شکایت ہے ملک کے دونوں حصوں کی اکثریتی پارٹیوں کو اقتدار سپرد کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ دراصل اسلام پسند ٹولے کے ارکان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر شیخ مجیب کو اپنی خدمات پیش کر چکے تھے اور یہ توقع رکھتے تھے کہ عوامی لیگ کے سربراہ بھٹو کو نظر انداز کر کے انہیں حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دیں گے، لیکن صدر مملکت کے دانشمندانہ اقدام سے ان کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے

قیوم خٹک اتحاد

صوبہ سرحد کے ضمنی انتخابات میں پشاور، مردان ہزارہ کی دو نشستیں جیتنے پر قیوم خان کے حواریوں نے جو پورا ہفتہ جشن منا کر کم ظرفی کی ایک نئی روایت قائم کی ہے یہ قیوم خان کی اپنی چھوڑی ہوئی سیٹیں ہیں لطف یہ کہ ان دو سیٹوں پر جو امیدوار کامیاب ہوئے ہیں ان میں سے یوسف خٹک کونسل لیگ اور محمد حنیف کنونشن لیگ سے تعلق رکھتے ہیں قیوم خان نے انہیں ٹکٹ دیتے ہوئے یہ ڈھونگ رچانے کی کوشش کی کہ تینوں مسلم لیگیں متحد ہو گئی ہیں لیکن کونسل لیگ اور کنونشن لیگ کے رہنما اس کی سختی سے تردید کر چکے ہیں اور دونوں کے بیانات سے تو بالکل واضح ہے کہ قیوم خاں سے اتحاد ناممکنات میں سے ہے۔ ایک طرف یوسف خٹک اب تک صوبہ سرحد میں صوبائی کونسل لیگ کے صدر رہیں دوسری جانب ان کی کامیابی قیوم خان کی مرہون منت ہے۔ آگے چل کر وہ کس گروپ کا ساتھ دیں گے۔ جو لوگ یوسف خٹک کے ماضی سے واقف ہیں اور وہ منظر دیکھ چکے ہیں جب آج سے بیس برس پہلے قیوم خان کی وزارت عظمیٰ کے دور میں اسی یوسف خٹک نے قیوم خان کے احسان کا بدلا یوں چکایا کہ صوبائی مسلم لیگ کی صدارت کے انتخاب میں اُن کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی تھی اور پھر اس کا خمیازہ مسٹر خٹک کو یوں بھگتنا پڑا کہ صوبائی انتخاب میں مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے کے باوجود قیوم خان کی ناراضگی کے باعث ایک آزاد امیدوار کے ہاتھوں پٹ گئے تھے بیس برس کے بعد یوسف خٹک اور قیوم خاں پھر متحد ہوئے لیکن یہ "اتحاد" صرف مسٹر

خٹک کے کامیاب ہونے تک تھا۔ اس سے آگے یہ گاڑی چلتی نظر نہیں آتی۔

کسان لیڈروں کے خلاف غیر ذمہ دارانہ بیان

سرحد پیپلز پارٹی کے رکن نثار محمد خان نے (جو چارسدہ کی مرکزی نشست میں نیپ کے سربراہ عبدالولی خاں کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکے) اپنے ایک حالیہ بیان میں کہا ہے کہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے سوا کسی جماعت کو مزدوروں کسانوں کی نمائندہ جماعت نہیں سمجھتے اور اسی نظریہ کے تحت وہ سرحد مزدور کسان پارٹی کو مزدوروں کسانوں کی نمائندہ جماعت تصور نہیں کرتے۔ اس سے پہلے پیپلز پارٹی کے امیدوار نصراللہ خٹک نے یوسف خٹک کی کامیابی پر اسے مبارکباد پیش کرتے ہوئے ایک اخباری بیان میں کہا "مجھے خوشی ہے کہ استحکام پاکستان پر یقین رکھنے والی جماعت کا امیدوار کامیاب ہوا ہے اور نیپ کا امیدوار کامیاب نہیں ہوا جس کی اپنے ملک سے وفاداری مشکوک ہے"۔

اب وقت آگیا ہے کہ پیپلز پارٹی کے رہنما ایسے غیر ذمہ دارانہ بیانات دینے والے ممبروں کا محاسبہ کریں جو یا تو پارٹی کی پالیسی سے بالکل بے بہرہ ہیں یا پھر اپنے مفاد کے لئے پارٹی کا نام استعمال کر کے اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ نثار محمد خان اگر پیپلز پارٹی کو مزدوروں کسانوں کی جماعت سمجھتے تو مزدور کسان پارٹی کی مخالفت کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتے۔ اس پارٹی نے اس علاقے میں کسانوں میں جو بیداری پیدا کی ہے اس کی مثال سارے ملک میں نہیں ملتی، اس کے مقابلے میں نثار محمد خاں نے کسانوں اور کھیت مزدوروں کی یہ خدمت کی کہ ہشت نگر کے خوانین کے ساتھ مل کر ان پر گولیاں چلائی ہیں انہیں جبری طور پر بے دخل کیا ہے اور ان کے گھر جلائے ہیں مظلوم کسانوں کے خلاف اور خوانین کی حمایت میں ان کے بیانات جو اخبارات میں چھپے ہیں ان کی ابھی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی انہیں مزدوروں کسانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے

ریت ملا ہوا پانی پینا پڑتا ہے

گل بہار کالونی کے باشندوں کو ایک عرصہ سے ریت ملا پانی مل رہا ہے جس سے پوری آبادی پیٹ کے امراض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ یہاں تقریباً تین برس پہلے ستر ہزار روپے پر ایک ٹیوب ویل لگانے کا ٹھیکہ دیا گیا۔ ٹھیکے دار نے مل ملا کر ۳۰۰ فٹ کی بجائے ۲۵۰ فٹ کھدائی کر کے بل وصول کر لیا اور لوگ چیختے چلاتے رہ گئے پوری کھدائی نہ ہونے کے باعث پچھلے سال پانی میں ریت آنے لگی مسلسل احتجاج کے بعد بلدیہ کے ایڈمنسٹریٹر بریگیڈیر خلجی نے اس ٹیوب ویل کو ٹھیک کرنے کے بجائے دوسری ٹیوب ویل بنانے کی منظوری دے دی انجنیئروں نے مشورہ دیا کہ یہ ٹیوب ویل گل بہار کالونی ۲ میں لگایا جائے یا کم از کم موجودہ ٹیوب ویل سے ۱۰۰ فٹ فاصلے پر ہو لیکن ایڈمنسٹریٹر صاحب نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا اور خود سری کر کے صرف دس فٹ کے فاصلے پر کام شروع کرا دیا۔ ایک ہفتہ بورنگ ہوتی رہی لیکن آگے کام نہ چل سکا کیونکہ نیچے جا کر پانی کے تیز بہاؤ نے سوراخ ڈال کر دونوں کنوئیں ملا دیئے اس طرح ہزاروں روپے کے سٹینر اور پائپ بھی ضائع ہوئے اور کسی دوسری موزوں جگہ یہ ٹیوب ویل لگانے کے بجائے کام ہی بند کرا دیا گیا یعنی ایڈمنسٹریٹر صاحب کی خود سری کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑا یہ ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ کا نقصان جو ان دو ٹیوب ویل میں بلدیہ کو ہوا اس کی ذمہ داری کس کے سر ہوگی۔ اور قومی صحت جو اس مضر پانی سے متاثر ہو رہی ہے اس کے

سرحد میں پیپلز پارٹی
کے رہنما کسانوں کے خلاف
خوانین کی
حمایت میں
بیان
دے رہے ہیں

لئے کون جوابدہ ہوگا۔؟ آج نہیں تو کل بلدیہ کی انتظامیہ کو اس کا جواب ضرور دینا ہوگا۔

موجودہ ایڈمنسٹریٹر نے آتے ہی کمیٹی میں بہت سی نئی پوسٹیں سٹور افسر، سینی ٹیشن افسر وغیرہ کی بڑھائیں پھر ایک سال بعد یہ سب پوسٹیں ختم کر دیں۔ اب انہوں نے کمیٹی کے لئے اپنی پولیس کا عملہ رکھا ہے جس پر ہزاروں کا خرچ ہے۔ یہ پولیس، کمیٹی کی جائیداد کا کرایہ وصول کرنے کے لئے رکھی گئی ہے۔ حالانکہ مقدمہ کے بغیر بقایاجات وصول نہیں ہو سکتے سینیٹری انسپکٹروں کو چونگی اور سٹور پر محرر مقرر کیا جا رہا ہے۔ اور چونگی محرروں کو سینیٹری انسپکٹر لگایا گیا ہے۔ پرانے ریاستی نظام کی یہ خصوصیات سنتے آئے تھے بدقسمتی سے یہاں یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑا سینیٹری انسپکٹروں کا عملہ باقاعدہ کوالیفائیڈ ہوتا ہے ان میں سے بیشتر نے تو بلدیہ کے خرچ پر یہ ٹریننگ حاصل کی ہے۔ خلجی صاحب دس پندرہ برس پہلے بلدیہ کے ایڈمنسٹریٹر بن جاتے تو یہ ادارہ کم از کم اس زیاں سے تو بچ جاتا اگر واقعی چونگی کے محرر یہ کام کر سکتے ہیں تو ٹرینڈ لوگوں کی کیا ضرورت ہے۔ ڈاکٹر اور انجنیئر کا کام بھی شاید کسی دوسرے افراد سے لیا جا سکتا ہے خود خلجی صاحب کسر نفسی نہ کریں تو قانونی مشیر اور میونسپل مجسٹریٹ کے فرائض سنبھال کر یہ خرچ بچا سکتے ہیں

مفت ڈگریوں کا تقاضہ؟

اسلامیہ کالج، گورنمنٹ کالج اور ایڈورڈز کالج غیر معینہ عرصے کے لئے بند کر دیئے گئے یہ قدم ان کالجوں کے لڑکوں کی ہڑتال اور مظاہروں کے بعد اٹھایا گیا۔ ان طلبا کا مطالبہ ہے کہ ڈی ٹینشن کے امتحانات نہ لئے جائیں اور پچھلے سال کی طرح اس دفعہ بھی فسٹ ایئر اور تھرڈ ایئر کے طلبا کو امتحان کے بغیر پروموشن دے دی جائے۔ طلبا کے مطالبات کی ترقی پسند حلقوں نے ہمیشہ حمایت کی ہے لیکن یہ مطالبات سراسر ناجائز ہیں۔ ہمارا تعلیمی معیار پہلے ہی روبہ زوال ہے، اگر امتحانات کی قید اٹھا دی گئی اور اس طرح ترقیاں ہونے لگیں تو رہا سہا معیار بھی غارت ہو جائے گا۔ شاید کل کو یہ منہ زور بچے ڈگریاں بھی مفت لینے کا تقاضا کریں۔ پچھلے برس بغیر امتحان کے ترقی دینے کی جو غلط روایت قائم کی گئی اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ یہ ناجائز مطالبہ آج پھر دہرایا جا رہا ہے

ایک رہنما کی رحلت

خاکسار تحریک میں بائیں بازو کے رہنما مسٹر نذیر ساول کی اچانک وفات نے یہاں کے سیاسی سماجی اور ثقافتی حلقوں کو سوگوار بنا دیا۔ مرحوم علامہ مشرقی کے دست راست تھے تحریک کے لئے انہوں نے بڑی قربانیاں دیں اور تحریک کے اندر ہمیشہ بائیں بازو کی رہنمائی کرتے رہے آپ مشہور سوشلسٹ لیڈر کاکا صنوبر حسین کے پرانے ساتھی تھے یہ اسی تربیت کا اثر تھا کہ وہ زندگی بھر مزدوروں کسانوں اور محنت کشوں کا ساتھ دیتے رہے اور ترقی پسند قوتوں کا سہارا بنے رہے قومی اور سماجی خدمات کے لئے انہوں نے مختلف اوقات میں کئی تنظیمیں قائم کیں اور ان میں بھرپور حصہ لیا سرحد میں مزدور کسان پارٹی اور دوسری تمام ترقی پسند سیاسی جماعتوں کو ہمیشہ ان کی پوری حمایت اور تعاون حاصل رہا ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۲۰ء سے ہوا اور پوری نصف صدی تک ایک چٹان کی طرح وہ رجعتی طاقتوں سے نبرد آزما رہے۔ درحقیقت مسٹر ساول کی وفات سے ہمارے سیاسی اور سماجی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے مشکل سے پورا کیا جا سکے گا۔

خدا رحمت کند۔ این عاشقان پاک طینت را

مکتوب حیدرآباد: احمد الطاف
نمائندہ خصوصی
"لیل ونہار"

شکست خوردہ عناصر حکام سے مل کر لسانی فساد پھیلا رہے ہیں

سندھ یونیورسٹی سنڈیکیٹ میں پیر حسام الدین کی قرارداد کس طرح منظور ہوئی؟

حیدرآباد کا لسانی ہنگامہ
ایک بس کو آگ لگا دی گئی

حیدرآباد اشک آور گیس سے دھواں دھار ہے۔ اردو کی حمایت میں بھوک ہڑتال جلوس اور مظاہرے جاری ہیں۔ ۲۱ جنوری کو اردو کے حامی طلباء نے ثانوی تعلیمی بورڈ کے دفتر کو گھیر کر سیاہ پرچم لہرا دیا۔ پولیس اور طلباء میں گھنٹوں دوبدو تصادم ہوتا رہا۔ طلباء کی سنگ باری پر پولیس کا لاٹھی چارج۔ نصف درجن طلباء زخمی ہوئے۔ ممتاز جنیدی سمیت چار طلباء گرفتار کئے گئے۔ ۲۲ جنوری کو پولیس نے اردو کے حامی طلباء کے ایک احتجاجی جلوس پر اشک آور گیس پھینک کر بمشکل منتشر کیا۔ بعد میں پولیس نے دس طالب علموں اور کچھ انجان راہگیروں کو حراست میں لے لیا۔ شہر میں ایک ماہ کے لئے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔

سندھ میں موجودہ لسانی نزاع کو "بیوروکریسی" کے ایک خاص گروہ اور انتخابات میں شکست کھانے والے عناصر نے بھڑکایا ہے۔ مقصد زبان وادب کا فروغ نہیں بلکہ عوام کی توجہ کو بنیادی مسائل اور معاشی اور طبقاتی جدوجہد سے ہٹانا ہے۔ ورنہ اس عبوری دور میں جبکہ ملک ایک نازک موڑ پر ہے یہ جھگڑا کیوں کھڑا کیا گیا۔ بعض دیگر حل طلب مسائل کی طرح لسانی مسئلہ کو بھی عوام کی نمائندہ حکومت پر چھوڑا جا سکتا تھا۔ آخر اس تنازعہ نے کیسے اور کہاں جنم لیا؟

جامعہ سندھ کی سنڈیکیٹ نے ۲۱ اگست ۱۹۷۰ء کو جناب حسام الدین راشدی کی پیش کردہ مندرجہ ذیل قرارداد اکثریت سے منظور کی جو فوری طور پر نافذ کر دی گئی۔

جامعہ سندھ
گشتی مراسلہ

نمبر اے سی-۱/۲۴۷/۱۹۷۰ء
جامعہ سندھ- جام شورو
مورخہ- ۹-۹-۱۹۷۰ء

سنڈیکیٹ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۱-۸-۱۹۷۰ء میں اپنی قرارداد نمبر ۷ کے تحت، سندھی کو فوری نفاذ کے لئے جامعہ سندھ کے کاروبار کی زبان اور اندرونی خط وکتابت کے لئے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

سنڈیکیٹ کی قرارداد اپنی حدود تک صرف داخلی کاروبار اور مراسلت کے اجرار کا ضابطہ وضع کرتی ہے۔ تاہم چانسلر اور حکومت سے خط وکتابت انگریزی میں جاری رہے گی۔

مذکورہ بالا فیصلہ پر برائے کرم ضروری اقدامات کئے جائیں۔

دستخط
۹-۹-۱۹۷۰

نقل جملہ متعلقین کے لئے

(پروفیسر ڈاکٹر این بی جی قاضی)
رجسٹرار جامعہ سندھ، جام شورو۔

واضح ہو کہ یونیورسٹی آرڈی ننس کے تحت سنڈیکیٹ گیارہ نامزد ارکان پر مشتمل ہے۔ ۲۱ اگست ۱۹۷۰ء کو جامعہ سندھ کی سنڈیکیٹ کے اجلاس میں گیارہ میں سے نو اراکین حاضر ہوئے کیونکہ دعوت نامے صرف ایک روز پہلے جاری کئے گئے۔ سنڈیکیٹ کے ایک ممبر نے شکایت کی کہ مجھے دعوت نامہ صرف چند گھنٹے قبل موصول ہوا اور وہ بھی ایجنڈے کے بغیر۔ مصدقہ ذرائع کے مطابق جب اجلاس میں جناب حسام الدین راشدی نے مذکورہ بالا قرارداد نمبر ۷ پیش کی تو قرارداد کی

موافقت و مخالفت میں تند و تیز مباحثہ شروع ہو گیا۔ جناب احمد سعید خاں اور جناب حاذق علی نے قرارداد کو مبہم اور یکطرفہ قرار دیتے ہوئے اُسے آئندہ انتشار و خلفشار کا پیش خیمہ کہا اور خطرات کی نشاندہی کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ قرارداد کی مخالفت میں تقریریں کیں بلکہ اختلافی نوٹ بھی تحریر کئے۔ بہر کیف قرارداد کثرتِ رائے سے منظور ہو گئی۔

ازاں بعد قومی و علاقائی اخبارات میں اس فیصلہ کے موافق و مخالف بیانات اور مراسلوں کی سرد جنگ شروع ہو گئی۔ جامعہ سندھ اور اس کے وائس چانسلر کے اقدامات کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات کے ساتھ احتجاجی مہم چلائی گئی۔

بے شمار بیانات اور ان گنت مراسلے شائع ہوئے۔ بعض میں جامعہ سندھ کے اس فیصلہ کو مستحسن قرار دے کر سراہا گیا۔ بعض میں سندھی اپنانے کی تعریف کرتے ہوئے اردو کو یکسر نظرانداز کرنے پر نکتہ چینی کی گئی۔

سندھ میں اردو کی ترویج و اشاعت کے ایک سرگرم علمبردار اور ماہنامہ "نئی قدریں" کے مدیر اختر انصاری اکبرآبادی نے نمائندہ "لیل و نہار" کو بتایا کہ "ہم سندھی کو عزیز جانتے ہیں۔ اور اسے اردو کی حریف تصور نہیں کرتے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ سندھی برقرار رہے لیکن انگریزی کی جگہ اردو رائج کی جائے۔ سندھ یونیورسٹی کا اقدام نیک نیتی پر مبنی نہیں بلکہ سندھی کی آڑ لیکر اردو دشمنی کا مظاہرہ ہے جس کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ سندھ یونیورسٹی سے اردو کو دیس نکالا دیدیا گیا ہے۔ جامعہ سندھ کے تمام شعبوں، ہوسٹلوں، دفاتر اور سڑکوں کے نام صرف انگریزی اور سندھی میں تحریر کئے گئے ہیں جو ایک مخصوص ذہنیت کی غمّاز ہیں۔"

پھر انتخابی ہنگاموں میں لسانی مسئلہ پس منظر میں چلا گیا۔ درحقیقت اس تنازعہ کو ہوا دینے والے سیاسی عناصر اُن کی حامی نوکرشاہی کے بعض حکام اور کارکن انتخابی مہم میں شب و روز مصروف ہو کر یا تو اس مسئلہ پر مصلحتاً خاموش ہو گئے یا عارضی طور پر فراموش کر بیٹھے۔ چنانچہ لسانی لووں کی صدائے بازگشت اب پھر بلند ہوئی ہے۔ جس کی گونج سندھ یونیورسٹی کی پیروی میں ثانوی تعلیمی بورڈ حیدرآباد کے مندرجہ ذیل فیصلہ سے برپا ہوئی ہے۔

بورڈ برائے انٹرمیجیٹ و ثانوی تعلیم حیدرآباد

بورڈ برائے انٹرمیجیٹ و ثانوی تعلیم حیدرآباد کا ایک اجلاس پیر ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۰ء کی صبح ۱۰ بجے چیئرمین کے دفتر میں منعقد ہوا۔ (جس میں دس نامزد اراکین میں سے نو ارکان حاضر تھے) ڈاکٹر اے ایم شیخ نے سندھی کو بورڈ کی دفتری زبان بنانے کی تجویز پیش کی۔ تین اراکین کی مخالفت کے باوجود قرارداد کثرت رائے سے منظور ہو گئی، بورڈ کی قرارداد حسب ذیل ہے:۔

"قرارداد نمبر ۱۲ کی رو سے تجویز کی گئی کہ سندھی کو بورڈ کی دفتری زبان کے بطور اختیار کیا جائے۔

مزید تجویز کیا گیا کہ اردو و مادری زبان والے طلباء کے لئے سال ۷۲-۱۹۷۱ء سے اور جو ثانوی اسکول سرٹیفکیٹ حصہ اوّل کے ۱۹۷۲ء میں منعقد ہونے والے سالانہ امتحان میں بیٹھ رہے ہیں، کے لیے سلیبس سندھی کا مضمون لازمی مضمون کی حیثیت سے متعارف کیا جائے۔ ناظم تعلیمات نے یہ بھی مشورہ دیا کہ حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ اسے ہائی اسکول کی کسی مناسب سطح پر بھی متعارف کرائے۔"

بورڈ کے اس فیصلے کے خلاف احتجاجی مہم کے ساتھ لسانی مسئلہ دوآتشہ بن کر پھر ہنگامہ خیزی کا سبب ہو گیا۔ بیان بازی اور مراسلہ نگاری کا کاروبار پھر تازہ ہو گیا۔ بورڈ کے فیصلہ کے خلاف اور اردو کی حمایت میں جمعرات ۷ر جنوری کو حیدرآباد شہر میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ بازار اور دکانیں بند رہیں۔ قومی و صوبائی اسمبلی کے نو منتخب ارکان پر مشتمل ایک چار رکنی وفد نے اس سلسلے میں صوبائی گورنر سے کراچی میں ملاقات کر کے عرضداشت پیش کی۔ تحریک تحفظ اردو کے زیر اہتمام ۱۵ر جنوری سے حیدرآباد میں اور پھر نواب شاہ اور میرپور خاص میں اردو کے حامی طلباء نے بھوک ہڑتال شروع کر دی جو تادم تحریر جاری ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ نواب شاہ اور میرپور خاص میں اردو کے لئے بھوک ہڑتال کرنے والوں میں نئے سندھیوں کے ساتھ پرانے سندھی عزیز اللہ ابڑو اور فقیر محمد سولنگی بھی شریک ہیں۔

دریں اثناء اطلاعات منظر ہیں کہ ۷ر جنوری سے سندھ گیر پیمانے پر مختلف مقامات میں یوم سندھی بولی منایا جا رہا ہے۔ سندھی روزنامہ "ہلال پاکستان" کی ایک خبر کے مطابق ۴ر فروری کو حیدرآباد میں سندھی زبان کا کنونشن منعقد ہوگا۔ اس سلسلے میں لالہ قادر، فاضل راہو اور یونس سومرو سندھ کا دورہ کر کے قومی و صوبائی اسمبلی کے ممبروں سے رابطہ قائم کر رہے ہیں۔

تازہ ترین صورت حال کے مطابق، لسانی تنازعہ کے باعث اندرونِ سندھ کی فضا تشویش ناک حد تک کشیدہ ہو چکی ہے! اندیشہ ہے کہ طلباء کے مابین تصادم، عوام تک پھیل کر فرقہ وارانہ فساد کی صورت نہ اختیار کر لے۔ ہرچند کہ امن دوست حلقے اور ترقی پسند قوتیں باہمی اپیلیں کر کے اور امن کمیٹیاں بنا کر حتی المقدور کوششیں کر رہے ہیں۔

بورڈ کے فیصلہ پر مختلف ردِ عمل

ثانوی تعلیمی بورڈ کے ایک رکن کا بیان:۔

"میں اس خطرہ کی نشاندہی کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر حالات بدستور چھوڑ دیئے گئے تو یہ عین ممکن ہے کہ ایک دن ایسا آجائیگا کہ دونوں طبقے اپنے اپنے الگ بورڈ اور جامعہ قائم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہوگی۔ یہ الفاظ سکھر سے ثانوی تعلیمی بورڈ کے رکن ماڈرن انگلش ہائی اسکول کے پرنسپل عبدالصمد خاں نے حرف سندھی کو سرکاری زبان بنانے کے فیصلے پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک وضاحتی بیان میں کہے۔

بورڈ کے ایک رکن کی حیثیت سے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ چیئرمین اجلاس کی صدارت اور صرف صدارت کرتا ہے اس کے آگے کچھ نہیں۔ جہاں تک اس غیر دانشمندانہ اور جذباتی قرارداد کی منظوری کا تعلق ہے چیئرمین بالکل مجبور و بے بس تھے (واضح رہے کہ بورڈ کے چیئرمین جناب احمد سعید خاں ہیں) کیونکہ بورڈ کی تمام قراردادیں اکثریت سے منظور ہوتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بورڈ کے چند ارکان کے رویے اور خوش فہمی کا یہ عالم ہوتا ہے گویا بورڈ کے تمام اختیارات کے واحد مالک ہی ہیں۔ اس قرارداد کی بحث کے دوران میں نے احتجاج ہی نہیں کیا بلکہ یہ بھی بتایا تھا کہ جامعہ سندھ کے اس قسم کے فیصلے کے ردِ عمل میں کافی احتجاج ہوا ہے۔ دونوں طبقوں میں کشیدگی و تلخی اب تک باقی ہے۔

میں نے ارکان بورڈ کو یہ بھی بتایا تھا کہ جہاں تک ہمارے سندھی سیکھنے کا تعلق ہے تو ہم لوگ شعوری و غیر شعوری طور پر سندھی کو اپنا رہے ہیں اور دونوں طبقے خود بخود ایک دوسرے میں ضم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے بچے تو اعلیٰ مرکزی سرکاری ملازمت کے مقابلے کے امتحان میں سندھی بطور ایک مضمون لیتے ہیں اور اس میں پاس بھی ہوتے ہیں۔ ان حالات کی روشنی میں یہ کہنا غلط ہے کہ ہم سندھی سے دور بھاگ رہے ہیں۔

سندھ این ایس ایف کے صدر نے کہا کہ سندھی کی تعلیم اردو بولنے والے طلباء کے مفاد میں ہے۔ اردو اور سندھی بولنے والے

اگر حقائق پر نظر ڈالی جائے تو صوبہ کا ہر ۲۴ سالہ نوجوان صوبہ کا پیدائشی باشندہ ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سرزمینِ سندھ اس کی جنم بھومی ہے۔ میں دونوں طبقوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اپنے اختلافات ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر کے آنے والی نسلوں کے مفاد اور خوشحالی کے لئے ایک دوسرے میں ضم ہو کر سرگرم عمل ہوں۔"

(بیان عبدالصمد خاں، رکن ثانوی تعلیمی بورڈ۔ بحوالہ "جنگ" کراچی مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۷۰ء)

حیدرآباد کے ایک ہائی اسکول ٹیچر نے بورڈ کی قرارداد پر اظہار خیال کرتے ہوئے نمائندہ "لیل و نہار" کو بتایا کہ "بھلا جن طلباء کو سندھی کی تعلیم ہی نہ دی گئی ہو وہ ثانوی اسکول سرٹیفکیٹ حصہ اوّل کے آئندہ سال ہونے والے امتحان میں کامیاب ہونے کے لئے استعداد کہاں سے لائیں گے؟ کیا بورڈ کا فیصلہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ طلباء نے بطن مادر ہی میں

سندھی سیکھ لی ہوگی جبکہ اُن کی مادری زبان بھی سندھی نہیں۔ بورڈ کو لازم ہے کہ وہ اپنے غیر حکیمانہ فیصلہ پر نظر ثانی کرے"۔

نوابشاہ کے ایک سرگرم قومی کارکن محمد امجد خاں نے کہا ہے کہ "اُردو کے خلاف صوبۂ سندھ میں متعصب سیول افسران اور جی ایم سیّد گروپ کے متعصب یونیورسٹی حکّام ایک سازش کے تحت اُردو کو ختم اور اُردو داں طبقہ پر ترقی کی راہیں مسدود کر رہے ہیں۔ بعض مفاد پرست عناصر یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ہم سندھی زبان کے مخالف ہیں۔ یہ بات سراسر غلط ہے ہمیں سندھی زبان اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ اُردو۔ ہماری جدوجہد اور تحریک کا مقصد اُردو زبان کو انگریزی زبان کی جگہ رائج کرانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سندھی کو سندھ یونیورسٹی اور ثانوی تعلیمی بورڈ حیدرآباد کی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا ہے حالانکہ ان دونوں اداروں سے ملحقہ اداروں میں ۵۲ فیصد اُردو داں طبقہ اور ۴۸ فیصد سندھی داں طبقہ کا تناسب ہے"۔ (بحوالہ "جنگ" کراچی مورخہ ۱۳ جنوری ۱۹۷۱ء)

علاقائی پریس کا رویّہ

سندھی اخبارات کے مطالعہ سے زبان سے متعلق اُن کے

طلباء کے لئے اُردو اور سندھی بالترتیب ہر سطح پر ذریعہ تعلیم ہوگی، اور دفاتر اور تقابلی امتحانات میں مادری زبان ہی صحیح اور بہتر ذریعہ ھے

موقف و مطالبات کا ماحصل حسب ذیل ہے۔

۱۔ صوبہ کی سرکاری زبان سندھی بنائی جائے۔

۲۔ سندھ اسمبلی کی کارروائی سندھی میں ہو۔

۳۔ عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمٰن اور پیپلز پارٹی کے ذوالفقار علی بھٹو سندھی کو پاکستان کی قومی زبان تسلیم کرائیں۔

۴۔ سندھ یونیورسٹی اور ثانوی تعلیمی بورڈ کے پرچے سندھی میں دیئے جائیں۔

۵۔ غیر سندھی طلباء کے لئے سندھی زبان پرائمری سے یونیورسٹی تک لازمی قرار دی جائے۔

۶۔ ریلوے اسٹیشنوں کے نام سندھی میں تحریر کئے جائیں۔

۷۔ موٹر گاڑیوں کی نمبر پلیٹ سندھی میں تحریر کرنے کے احکامات جاری کئے جائیں۔

۸۔ جامعہ کراچی میں سندھی شعبہ قائم کیا جائے۔

۹۔ حکومت سندھ کے ملازمین کے لئے سندھی فاضل امتحان لازمی قرار دیا جائے۔

۱۰۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر سندھی پروگرام کو جائز حصہ دیا جائے۔

۱۱۔ کراچی اور حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن میں سندھی پروگرام اور وقت بڑھایا جائے۔

۱۲۔ جامعہ سندھ اور سندھ سرکار دنیا کے مختلف ممالک میں سندھی زبان سکھانے کا انتظام کرے۔

۱۳۔ صدرِ مملکت اردو، بنگلہ، اور انگریزی کی طرح سندھی میں بھی بچوں کو صدارتی انعامات دیں۔

۱۴۔ حکومت سندھ کا رسالہ "اطلاعات" دوبارہ جاری کیا جائے۔

۱۵۔ سندھی اسٹوڈنٹس کلچرل آرگنائزیشن (S.S.C.O) ٹھٹھہ کا مطالبہ ہے کہ پرائمری سے اعلیٰ سطح تک سندھی میں مفت تعلیم دی جائے۔

ان لسانی مطالبات کے ساتھ بعض دیگر مطالبے بھی کئے جا رہے ہیں مثلاً:۔

۱۔ سندھ رجمنٹ بنائی جائے۔

۲۔ ملھ یا ملاکھڑہ (سندھی زور آزمائی یا کشتی) کے فائنل مقابلہ جیتنے والے کو رستم پاکستان کے خطاب سے نوازا جائے۔

طالب علم رہنماؤں کے بیانات

جی ایم سیّد کی حامی جئے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر مسٹر اقبال ترین نے کہا کہ "ہم سندھی کو پاکستان کی قومی زبان اور سندھ کی سرکاری و علاقائی زبان بنانا چاہتے ہیں۔ اور جو لوگ سندھ میں رہتے ہیں ہم اُن کے لئے سندھی کو پرائمری سے انٹر تک لازمی بنانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ سندھی دشمن عناصر کو اپنے ناپاک عزائم کے بارے میں ایک بار پھر سوچنا چاہیئے ورنہ ان کے لئے بچنے کی کوئی راہ نہ ہوگی۔

(بحوالہ "جنگ" کراچی مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۷۱ء)

اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک پرانے سندھی طالب علم رہنما نے کہا کہ "یہ خیالات عصبیت اور فسطائیت سے آلودہ ہیں، اور دراصل پیپلز پارٹی کے ہاتھوں شکست خوردہ ہو کر جذباتی غبار نکالا گیا ہے۔"

نوشہرو فیروز میں سندھ آزاد اردو دڑا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قاضی نیک محمد نے کہا کہ سندھی قدیم تاریخی زبان ہے۔ اس نے اسلامی فکر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

سندھ این ایس ایف کے صدر کا بیان

سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر مسٹر مہر حسین شاد نے گذشتہ دنوں میرپور خاص میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستان ایک کثیر الاقوام ریاست ہے جس میں سندھی، بلوچی، پنجابی اور پشتو زبانوں کو بھی قومی زبانوں کا درجہ دے کر ان کے حقوق بحال کئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ ہماری تنظیم کبھی نہیں چاہتی ہے کہ ملک میں فرقہ وارانہ فساد ہوں اور طبقاتی و قومی جدوجہد کو سبوتاژ کیا جائے۔ مخصوص مفادات رکھنے والے طبقات اس منافرت کو ہوا دے رہے ہیں۔ مذہب اور زبان کے اختلاف کے باوجود محنت کش عوام کے مفادات یکساں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ زبان غاصب نہیں ہوتی اس لئے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور معاشرے کا ہر فرد غریب خواہ امیر بولتا ہے لیکن سرمایہ دار طبقہ کسی ایک زبان کو استحصال کے لئے استعمال کر سکتا ہے جیسا کہ پاکستان میں سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی کے حقوق کی نفی کرتے ہوئے کیا گیا جس کی وجہ سے کشیدگی پھیلنا لازمی امر ہو گیا۔ مہر حسین شاہ نے کہا کہ اُردو پاکستان کے ہر حصے کی قومیتوں کے مابین رابطے کی زبان ہے۔ لیکن پاکستان میں اُردو نام کی کوئی قوم نہیں۔ اُردو بولنے والے صوبہ سندھ میں خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ جن کے اقتصادی و سیاسی مفاد پرانے سندھیوں کے مساوی ہیں انہوں نے جامعہ سندھ اور حیدرآباد بورڈ کے فیصلوں کو سراہتے ہوئے مطالبہ کیا کہ صوبہ سندھ کی عدالتی سرکاری اور دفتری زبان سندھی قرار دی جائے۔ لیکن جامعہ سندھ اور بورڈ کی قرار دادیں مختصر مبہم اور ناکافی ہیں جس میں اُردو کی حیثیت کو قطعی نظر انداز کیا گیا ہے۔ اگر ایسا دانستہ کیا گیا ہے تو درست نہیں اور نادانستہ کیا گیا ہے تو اس کی تلافی کر کے غلط فہمی کو دور کیا جائے۔

سندھ این ایس ایف کے صدر نے کہا کہ سندھی کی تعلیم اُردو بولنے والے طلباء کے مفاد میں ہے اردو اور سندھی بولنے والے طلباء کے لئے اُردو اور سندھی بالترتیب ہر سطح پر ذریعہ تعلیم ہوگی اور دفاتر اور تقابلی امتحانات میں مادری زبان ہی صحیح اور بہتر ذریعہ ہے۔ انہوں نے فرقہ پرستی اور فسطائیت کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ہم بین الاقوامیت میں یقین رکھتے ہیں لیکن یہ مقصد تب تک حاصل ہونا ناممکن ہے جب تک پاکستان کی تمام قومیتوں کے لسانی ثقافتی اور قومی حقوق کو تسلیم نہ کیا جائے۔"

ترقی پسند ادیب کا موقف

لاء کالج میرپور خاص کے ایک طالب علم لیڈر قیوم شاہد نے کہا کہ سندھ یونیورسٹی اور ثانوی تعلیمی بورڈ حیدرآباد نے سندھی کو فروغ دینے کے لئے جو فیصلہ کیا ہے وہ اس لحاظ سے تو قابلِ تعریف ہے کہ اس طرح سندھی زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا لیکن اس فیصلہ پر جس طرح عمل کیا جا رہا ہے وہ قابلِ مذمت ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نیک نیتی سے نہیں کیا گیا بلکہ اس کے پیچھے اُردو دشمنی اور سندھ کے عوام میں نفاق پیدا کرنا ہے۔

(بحوالہ "جنگ" مورخہ ۱۳ جنوری ۱۹۷۱ء)

اُردو کے ایک ترقی پسند ادیب نے جو اپنے نام کی اشاعت کے خواہاں نہیں زبان کے مسئلہ پر اپنا موقف بیان کرتے ہوئے

نمائندۂ "لیل و نہار" سے کہاکہ "اردو کو جس قدر نقصان مسلم لیگ اور اردو کے نادان دوستوں نے پہنچایا ہے کسی اور نے نہیں پہنچایا۔ مسلم لیگ نے سیاسی مصلحت کی خاطر اردو کا ناطہ اسلام اور پاکستان سے جوڑ کر اردو کو دیگر مذاہب کے پیرکاروں اور دیگر اقوام سے دور کر دیا۔ انہوں نے اردو کے واحد اجارہ دار بن کر عوام کے مشترکہ ذریعہ اظہار، اردو زبان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

اردو کے نادان دوستوں نے ایک زمانہ میں اردو کو جو خود بخود پروان چڑھ رہی تھی دیگر مادری زبان بولنے والوں پر مسلط کر کے اردو کو علاقائی زبانوں کا جلاد بنانا چاہا جبکہ اردو مختلف علاقوں اور خطوں کی بولیوں کی عوامی آمیزش سے وجود میں آئی ہے۔ اس طرح اردو جیسی شیریں زبان کو اس کی ماخذ علاقائی زبانوں کا قاتل بنانا خود اردو کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔

اردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی حمایت و وکالت زیادہ تر فرقہ پرست عناصر کی جانب سے کی جاتی رہی ہے۔ حالانکہ نہ تو اردو اور نہ ہی کوئی دوسری زبان فرقہ پرست، غاصب یا سامراجی ہوتی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ترقی پسند قوتیں، رجعت پسند اور فرقہ پرست عناصر سے اردو کی ٹھیکہ داری چھین لیں۔ اردو کو فرقہ پرست عناصر کی حمایت سے جس قدر جلد نجات ملے گی، اتنی ہی جلد اردو کے خلاف ضد ختم ہوگی۔ یہ اردو کے انہیں جنونی نادان دوستوں کی کارگذاری ہے کہ شعوری اور رضاکارانہ طور پر اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والے اردو کے خواہ مخواہ مخالف بن رہے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ہر بچے کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جانی چاہیئے یہ ہر بچے کا پیدائشی حق ہے۔ پاکستان کی تمام قومیتوں کی زبانوں کو ان کا جائز حق اور حیثیت ملنی چاہیئے۔

اس سوال پر کہ سندھ کو دو لسانی صوبہ قرار دینے سے سندھی قومیت کی نشوونما اور یک جہتی مجروح ہوگی؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ دو لسانی صوبہ تو بن چکا ہے۔ اگر قیام پاکستان سے پہلے ایک زبان اور دو مذاہب تھے تو قیام پاکستان کے بعد ایک مذہب اور دو زبانیں ہو گئیں۔ اگر اس وقت قومیت ایک ہو سکتی تھی تو اس وقت بھی ہو سکتی ہے۔ جو لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ تاریخ میں تو ایسا نہیں ہوا تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ گزشتہ ربع صدی کے اندر ایسے تاریخی عجوبے — (Historical Anamoly) رد ہو کر زندہ حقیقت بن چکے ہیں جو ہزار دس برس کی تاریخ میں واقع نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً جرمنی، کوریا، اور ویت نام جن میں سے ہر ملک ایک ہوتے ہوئے دو ہو چکے ہیں۔ تاریخ میں تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک ہی ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے سے ایک ہزار میل دور واقع ہو لیکن اس فاصلے کے باوجود عالمی نقشہ پر پاکستان ایک زندہ و تابندہ حقیقت ہے۔

لیل و نہار

ظہیر اختر بیدری

کچھ لوگوں کی زندگی جیل میں گذرتی ہے

کچھ لوگ عمر قید کی میعاد جیل سے باہر گذارتے ہیں

۲۰ جنوری کی ایک خبر کے مطابق گورنر پنجاب لیفٹننٹ جنرل عتیق الرحمان نے اپنے ملتان جیل کے معائنہ کے دوران میں ایسے ساٹھ قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا ہے جن کی سزا کی تقریباً میعاد تین ماہ رہ گئی تھی۔

پاکستانی جیلوں میں قیدیوں کا حال زمانہ قدیم کے غلاموں سے بھی بدتر ہے۔ جیلوں میں قیدی جیل حکام کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ جیل، سپاہیوں اور جیلروں کی شکایت پر قیدیوں کو ۳۰، ۴۰ کوڑوں کی سزا دینے کا مجاز ہے "گستاخ" قیدیوں کو پنشمنٹ وارڈ میں رکھ کر صبح شام بری طرح زدوکوب کیا جاتا ہے۔ اس نوع کے تشدد سے اب تک مختلف جیلوں میں کئی قیدی ہلاک ہو چکے ہیں!

اس دہشت گردی کا "جواز" جیل کے حکام یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر قیدیوں پر سختی نہ کی جائے تو انہیں کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس توجیح میں کتنی جان ہے اس سے قطع نظر جیلوں کے حکام کی اس دہشت گردی کے قیدیوں پر اثرات کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

طویل مدت کی سزائے قید پانے والے ملزم جیل حکام سے ہر وقت خائف رہتے ہیں اس لئے کہ ان کی معمولی ناراضگی قیدیوں کے لئے تباہی کا پیغام بن جاتی ہے۔ انہیں مختلف قسم کی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس میں ڈنڈا بیڑی پنشمنٹ وارڈ، جیل بدلی، لنگر ڈیوٹی، معافی کی میعاد میں تخفیف وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایسی سزائیں ہیں جن کے نام سے طویل مدت کی سزا بھگتنے والے قیدی ہمیشہ خائف رہتے ہیں۔ عام طور پر طویل مدت کی سزا بھگتنے والے قیدیوں کو مختلف شعبوں میں عام قیدیوں کے کام کی نگرانی پر مقرر کیا جاتا ہے۔ اس سہولت کے لئے بھی جیل حکام کی مٹھی گرم کرنا ضروری ہے۔ لیکن کسی وجہ سے جب ایسے قیدیوں سے جیل حکام ناراض ہو جاتے ہیں تو انہیں نگرانی کے کام سے ہٹا کر کسی سخت کام پر مثلاً لنگر خانہ، دری بنانے، قالین بنانے یا کھڈی چلانے پر لگا دیا جاتا ہے۔ یہ کام اتنے مشقت طلب ہوتے ہیں کہ جیل کے دردناک ماحول میں رہنے اور جیل کی ناقص غذا استعمال کرنے والے قیدی بہت جلد اپنی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ جیلوں میں ہسپتال اور ڈاکٹر موجود ہیں جیل کے بجٹ میں علاج کے نام پر ہزاروں روپے رکھے جاتے ہیں لیکن جیل کے ہسپتالوں میں عام طور پر ہر مرض کا علاج اے پی سی کی گولیوں سے کیا جاتا ہے۔ سنگین حالات میں پنسلین کا انجکشن دیدیا جاتا ہے۔ علاج کی ان "سہولتوں" کے پیش نظر عام طور پر قیدی بیماری کے نام سے لرزتے ہیں۔ سخت مشقت سے بچنے کے لئے طویل سزا پانے والے قیدی جیل حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ بظاہر وہ جیل حکام کا "احترام" کرتے ہیں لیکن ان کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے قیدیوں کے دلوں میں ہر وقت نفرت کا لاوا پکتا رہتا ہے۔ اکثر و بیشتر قتل کے جرم میں سزا پانے والے قیدی "عادی مجرم" نہیں ہوتے بلکہ وقتی اشتعال کے تحت یہ حرکت کر بیٹھتے ہیں جس میں ان کا قصور نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ ایسے قیدیوں کی حالت قابل رحم ہوتی ہے رات کو سلاخوں کے اندر جب اپنے پھٹے ہوئے کمبل پر یہ قیدی لیٹے ہوتے ہیں تو ان کی آنکھیں وارڈ کی سنگین چھت اور موٹی سلاخوں والی کھڑکیوں پر جمی رہتی ہیں۔ ان کی روح ان رکاوٹوں کو توڑ کر اپنے گھر پہنچنے کیلئے بیقرار رہتی ہے۔ جب وہ اپنی باقی سزا کا حساب کر کے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہیں تو کوئی سنگ دل انسان بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکتا۔ طویل سزا پانے والے قیدیوں کے لئے سزا کا ابتدائی زمانہ اور سزا کا آخری دور انتہائی اذیت ناک اور حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ خصوصاً سزا کے آخری حصے میں طویل سزا پانے والے قیدی اتنے بے چین رہتے ہیں کہ اگر ان کے بس میں ہو تو جیل کی دیواریں پھلانگ جائیں۔

جیل کے شب و روز

عمر قید اور طویل سزائیں پانے والے قیدیوں میں اکثریت ایسی ہے جو صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے پولیس اور اپنے مخالفین پر الزام لگاتے ہیں کہ انکی ملی بھگت سے انہیں سزا ملی ہے۔ جیلوں میں رہنے والے ان قیدیوں کو تو بری بھلی روٹی دال مل جاتی ہے لیکن ان قیدیوں کے خاندان کو خصوصاً بیوی بچوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کے لئے معاشی میدان میں قدم رکھنا ہر طرح سے مشکل ہے۔ خواتین کے لئے ایسے ادارے نہیں

جہاں سے وہ باعزّت طریقہ سے اپنا اور اپنے بچّوں کا رزق حاصل کر سکیں۔ ان بے سہارا خاندانوں کو حکومت کی طرف سے بھی کوئی تحفّظ حاصل نہیں ہے۔ مجرم ایک خود ہوتا ہے لیکن اس کے جرم کی سزا اِس کے سارے خاندان کو بھگتنی پڑتی ہے۔ ان ناکردہ گناہ بے بس افراد کے لئے دنیا جہنم سے زیادہ بدتر بن جاتی ہے۔ عمر قید پانے والے قیدیوں کی بیویاں اکثر حالات میں بدترین زندگی گزارتی ہیں اور ان کے بچے دربدر کی ٹھوکریں کھا کر آخر کار مجرموں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

عمر قید کی سزا پانے والے قیدیوں کے یہ تاثرات کراچی جیل کے چند قیدیوں سے ملاقات کے بعد پیش کئے جا رہے ہیں اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے سماج میں قانون، انصاف اور جیلوں کا کردار کیا ہے — !

یہ لوگ عمر بھر کے قیدی ہیں

محمد رزّاق کی عمر کوئی ۲۶ سال ہے۔ یہ نوجوان آزاد کشمیر کا رہنے والا ہے۔ محمد رزّاق ولیکا ٹیکسٹائلز ملز کے جنرل مینجر مسٹر آرتھر اسٹینس کی گاڑی کا ڈرائیور تھا۔ اسی غیر ملکی جنرل مینجر کے قتل کے الزام میں اسے ۱۴ سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ اس وقت محمد رزّاق کی عمر تقریباً ۱۸ سال تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ میں اپنے خاندان کا واحد کفیل تھا۔ رزّاق کی دو بیویاں ہیں اور دوسرے ۹ افراد رزّاق کے زیرِ کفالت تھے جنہیں رزّاق کی گرفتاری سے بے حد پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ رزّاق کو کم عمری کی وجہ سے ۲ سال ۸ ماہ تک لانڈھی کے بچّوں کی جیل میں رکھا گیا۔ جب وہ اپنی سزا کے باقی تین سال کا ذکر کرتا ہے تو اس کی آنکھیں نم آلود ہو جاتی ہیں۔

حاجی سندھ کا رہنے والا ہے اسے ۱۹۶۷ء میں ۱۴ سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ تقریباً دو سال تک اس پر مقدمہ چلتا رہا۔ ۲۰، ۲۵ افراد پر مشتمل اس کے خاندان کی کفالت بنیادی طور پر حاجی کی ہی ذمّہ داری تھی۔ اس کے ایک اور بھائی ہیں جو حاجی کی غیر حاضری میں پورے خاندان کی کفالت کا بار اُٹھائے ہیں لیکن ایک کمانے والے فرد کی غیر موجودگی میں اس کے خاندان کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اسے اب تک لاڑکانہ، سکھّر، حیدر آباد اور کراچی جیلوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ جب اسے اپنی باقی سزا کا خیال آتا ہے تو اس کے لبوں سے سرد آہ نکل جاتی ہے۔

سعید احمد کو ۱۴ سال قید با مشقت کی سزا دی گئی ہے۔ اب تک انہیں لاہور، میانوالی، منٹگمری، حیدر آباد اور کراچی کی جیلوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ ان کا خاندان دس افراد پر مشتمل ہے۔ ۱۹۶۱ء سے جب یہ گرفتار ہوئے ہیں ان کے خاندان کو بے حد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے صرف ایک ضعیف والد کی کوششوں سے ان کے خاندان کی انتہائی مشکل حالات میں گزر اوقات ہو رہی ہے۔ ان کی سزا ختم ہونے میں اب صرف سال سوا سال رہ گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سزا کا یہ آخری زمانہ انتہائی اذیت ناک اور اعصاب شکن ہے۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں ان کا خیال ہے کہ سنگین جرائم کا سبب معاشرے کی پیچیدگیاں ہیں۔ جب تک جرائم کے بنیادی اسباب کو ختم نہیں کیا جاتا اس وقت تک طویل اور سخت سزائیں دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

سجل ولد عبدالرحمٰن کو ۱۹۵۹ء میں عمر قید کی سزا ہوئی تھی اس نے اپنی سزا تقریباً پوری کر لی ہے۔ گرفتاری کے وقت اس کی عمر ۱۸۔ ۱۹ سال تھی اب رہائی میں چند ماہ رہ گئے ہیں۔ اس کی تین بہنیں اور دو بھائی ہیں جن میں کچھ اپنی برادری میں انتہائی تکلیف دہ حالات میں زندگی گزار رہے ہیں اور کچھ یتیم خانوں میں ہیں۔

یہ ہیں چند قیدیوں کے حالات جو لمبے عرصے سے جیلوں میں سزائیں کاٹ رہے ہیں۔ ہر سوسائٹی میں جرائم کی سزا ضروری ہے لیکن ایسے معاشرے میں جہاں جرائم کی بنیادی وجوہ ناخواندگی اور معاشی اور معاشرتی پریشانیاں ہوں وہاں محض سزا جرائم کی روک تھام کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ جرائم کے سلسلے میں دو پہلو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصاً قتل کے سلسلے میں اوّل مقتول کے متعلقین کی زندگی اور دوم قاتل کے متعلقین کی زندگی۔ مقتول اپنی جان سے جاتا ہے اور قاتل اپنے جرم کی سزا پاتا ہے لیکن وہ سزا جو ان دونوں کے زیرِ کفالت خاندان کو بھگتنی پڑتی ہے وہ انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے۔!

ترقی یافتہ ملکوں خصوصاً سوشلسٹ ملکوں میں اس قسم کے بے سہارا خاندانوں کی دیکھ بھال حکومتوں کی ذمّہ داری ہوتی ہے ہمارے ملک میں پہلی بار عوام کی منتخبہ حکومت بننے والی ہے اُس کا فرض ہے کہ وہ اس اہم مسئلہ کی جانب توجہ دے۔

ہندوستان سے ہمارے اختلافات

محض نفرت کی بُنیاد پر دُور نہیں ہو سکتے

ایک دردمند مسلمان کے قلم سے

ہمارے ہاں بعض ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں جنھیں بظاہر جماعتی نقطۂ نگاہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چند پُرجوش افراد، جن کے اخلاص میں کلام کی گنجائش نہیں، بطور خود ایک فیصلہ کر لیتے ہیں پھر اس پر قائم ہو جاتے ہیں اور ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے، جو بعض بُنیادی قومی مسائل کے لئے وجہ تشویش بن جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے ہمارے ان تعمیری منصوبوں کو کیوں کر فائدہ پہنچ سکتا ہے، جن کے بغیر اصل فلاحی کام شروع ہی نہیں ہو سکتا؟

پھر ابھی دستور کی منزل طے کر لینا ضروری ہے، جس کے بغیر مرکز یا صوبوں میں کوئی حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی اور جب تک حکومتیں قائم نہ ہوں، کوئی کام آئینی سطح پر شروع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر اس قسم کی گروہی سرگرمیاں کس اعتبار سے وجہ اطمینان سمجھی جا سکتی ہیں؟

ابھی کل کی بات ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے ایک طویل تقریر میں جہاں اور بہت سی باتوں کا ذکر کیا تھا، وہاں یہ بھی فرمایا تھا کہ ہمسایوں کے ساتھ ہمارے تعلقات خوشگوار رہنا چاہئیں اور ہمسایوں میں ہندوستان کا ذکر بھی بالتصریح کیا تھا۔ ہمارا ایک گروہ اس سے بے پروا ہو کر کھیل کے معاملے میں ایسی صورت پیدا کر رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی مخالفت زیادہ سے زیادہ بُری صورت اختیار کر لے اور سمجھا جائے کہ پاکستان میں کم از کم ایک گروہ ضرور موجود ہے، جسے اجتماعی اُصول پر کوئی کام کرنا منظور نہیں۔ جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس طرح دستور سازی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی یا کم از کم اس پارٹی کے لئے قدم آگے بڑھانا مشکل ہو گا جس کے ایک گروہ نے زیر غور طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ یا پارٹی کے لئے اپنے اس گروہ کے ولولے نظرانداز کر کے قدم آگے بڑھائے بغیر چارہ نہ رہے گا۔ بتائیے ان میں سے کون سی صورت ہمارے لئے یا منظم جماعتی زندگی کے لئے یا قومی مقاصد کی پیش برد اور جمہوریت کی جلد از جلد بحالی کے نقطۂ نگاہ سے مناسب سمجھی جا سکتی ہے؟

یہ بھی ظاہر ہے کہ گزشتہ تئیس سال میں پیش نظر طریقہ کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکا اور ہندوستان میں چھ کروڑ سے زیادہ مسلمان موجود ہیں، جو بیشتر اس وجہ سے اطمینان و دلجمعی کی زندگی سے محروم ہو گئے ہیں کہ ہمارے ہاں سے کوئی نہ کوئی گروہ ہندوستان کی مخالفت کے جوش میں آپے سے فرور باہر ہو جاتا ہے اور اس کی زبان سے آگ نکلنے لگتی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ جوش و خروش محض جوش و خروش ہی تک محدود رہ جاتا ہے۔ نہ اس سے کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ آج تک طے ہوا ہے، نہ طے ہونے کی اُمید کے اُفق پر روشنی کی کوئی کرن جلوہ گر ہوئی ہے۔ سفارتی و سیاسی تعلقات بدستور موجود ہیں۔ یہاں لاکھوں ایسے لوگ بستے ہیں، جن کے قریبی اعزاء ہندوستان میں رہتے ہیں۔ ان کے لئے جو مشکلات رونما ہیں یا ہو سکتی ہیں۔ ان کا بھی کسی کو خیال نہیں۔ یہ نہیں کہ اس قسم کی ہنگامہ آرائی کے ذمہ دار ایسے عوام ہوں جو مسائل کو ٹھیک ٹھیک سمجھ نہیں سکتے اور کسی معاملے میں نفع و نقصان کا اندازہ نہیں فرما سکتے۔ آخر یہ صورت حالات ہمیں کہاں پہنچائے گی؟

سب سے بڑھ کر ضروری امر یہ ہے کہ جو کچھ کیا جائے اطمینان سے مختلف گروہوں کے ساتھ بات چیت کر کے کیا جائے تاکہ قدم قدم پر ناخوشگوار حالات پیدا نہ ہوں لیکن ہمارے ہاں اس جماعت کے ذمہ دار افراد سے بھی مشورہ نہیں کیا جاتا، جس سے تعلق ہے اور جس نے نہایت اہم عوامی مسائل کے بارے میں گراں قدر ذمہ داری اُٹھا رکھی ہے

ہمارا بدترین دشمن امریکی سامراج

ابھی کل کی بات ہے کہ چند اصحاب نے ایک معاملہ میں ہنگامہ آرائی کی صورت پیدا کر دی اور یہ خیال نہ فرمایا کہ زیادہ بُنیادی مسائل طے کئے بغیر اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں جماعتی تنظیم کا اچھا ثبوت پیش نہیں کرتیں۔ وہ ہنگامہ آرائی ختم ہوئی تو اس کے ذمہ دار اصحاب مختلف شہروں میں جلسوں اور جلوسوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ بھی جماعتی زندگی کا کوئی قابل قدر مظاہرہ نہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیا ہماری مصیبتیں محض وہی ہیں، جن کا بار بار ذکر جلسوں اور اخباروں میں آتا رہتا ہے؟ ہماری مصیبتیں تو ان سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ جو امریکہ اسرائیل کو پے در پے زیادہ سے زیادہ اسلحہ دے کر مشرق وسطیٰ میں بہت بڑے دھماکے کا سروسامان کر رہا ہے۔ اور جو ہر مقام پر تحریک آزادی کے دشمنوں کو عام روایت کے مطابق اسلحہ کی مدد دے رہا ہے خواہ وہ پرتگال ہو جبشہ یا کوئی اور کیا اس کی روش قابل توجہ نہیں؟ کیا برطانیہ جنوبی افریقہ کو ہتھیار دینے سے پابندی اٹھا کر ایک بدفطرت اور ناپاک ذہنیت کے گروہ کو تقویت نہیں پہنچا رہا جس نے اہل افریقہ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے اور جو انسانیت کے ہر اچھے شیوہ و شعار سے یک قلم خالی ہے؟

خدا کے لئے کچھ سوچیے۔ جماعتی اور قومی کاموں کے سرانجام کی صورت یہ نہیں جب مختلف افراد کسی پارٹی سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو انہیں پارٹی کی تنظیم کو بہر حال تمام مصلحتوں پر مقدم رکھنا چاہیے تاکہ پارٹی کے لئے دوسری جماعتوں سے گفت و شنید اور حل مسائل میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ عمل کی یہ کون سی صورت ہے کہ جب چاہا خوفناک تقریروں کا توپخانہ لگا کر گولہ باری شروع کر دی۔ نہ احوال کا خیال نہ معاملات کا احساس نہ یہ خبر کہ ہم کس منزل میں بیٹھے ہیں اور ابھی ہمارے سامنے کون کون سے مراحل ہیں نہ یہ احتیاط کہ ہمیں ملک کے دوسرے فریقوں کو ساتھ لے کر سب فیصلے کرنے ہیں اور دوسرے فریقوں میں سب سے بڑھ کر قابل توجہ عوامی پارٹی ہے جسے ملک بھر میں واضح اکثریت حاصل ہے کاش ہمارے یہ بھائی وہ طریقہ اختیار کریں، جو جماعتی و قومی معاملات کی اصلاح و درستی کے لئے مفید و معاون ہو سکے موجودہ روش ہیں تو کوئی بھی صورت کسی نقطۂ نگاہ سے معقول یا نتیجہ خیز نظر نہیں آتی، اس سے تو عام لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ عوام کی نمائندگی حاصل کرتے ہی سمجھ لیا گیا ہے کہ جو کچھ ہم کریں گے وہ بہرحال ضروری ہے اور اسی سے تمام اصلاحی اور فلاحی منصوبے بروئے کار آئیں گے۔ نیز عوام میں ہمارے سوا کسی کا نام ہر دلعزیز نہ ہو گا

ہمیں جہاں اپنے ملک کے حالات کو بہترین اصلاحی حدود پر لانا ہے۔ جہاں دس بارہ فی صد اہل ثروت اور پچاسی نوّاسی فی صد عوام میں توازن پیدا کرنا ہے تاکہ سب خدا کی نعمتوں سے یکساں مستفید ہوں۔ وہاں ان قوتوں کو بھی توڑنا ہے، جو سامراج کو نئے رنگ میں جا بجا مسلط کر رہی ہیں اور ان میں امریکہ سب سے آگے ہے۔ اسی کی وجہ سے بین الاقوامی انجمن صلح و امن معرض خطر میں پڑی ہوئی ہے یہ امریکہ ہی ہے جس نے تئیس برس سے ستر کروڑ چینیوں پر انجمن اقوام متحدہ کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ حالانکہ وہ دنیا کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ہیں اور امریکہ کے مقابلے میں چین بہ اعتبار آبادی تین اور چار گنا کے درمیان ہے،

بلاشبہ ہندوستان سے ہمارے اختلافات ہیں اور خاصے سنگین ہیں لیکن تئیس سال تک اظہار نفرت کرتے جانے سے ان میں کون سی اصلاح ہوئی؟ بہتر یہ ہے کہ ذرا تحمل و بردباری سے کام لے کر دوسرے وسائل کا بھی تجربہ کر دیکھا جائے اور یاد رکھئے نفرت کی بنا پر کسی بھی قوم کی تعمیر کامیاب نہیں ہوئی ہٹلر نے سب سے بڑھ کر موثر پروپیگنڈے کا نظام بنایا۔ لیکن وہ بے مثال جنگی قوت کے باوجود کسی بھی دائرے میں کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ اس کی بنیاد صرف نفرت پر تھی۔

نامہ و پیام

سندھی اور اردو دونوں سندھ کی زبانیں ہیں

ادھر کچھ روز سے زبان کے نام پر ہنگامے ہو رہے ہیں۔ ایک طرف چند رجعت پسند لوگ اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کے لئے اردو دوستی کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں نکل آتے ہیں تو دوسری طرف کچھ طلبا اور کچھ ان کے مشیر جو خود کو نیشنلسٹ کہتے ہیں اشتعال انگیز بیان دے رہے ہیں۔ اور اس طرح صوبہ کی پُرامن فضا کو مکدّر کر رہے ہیں۔

بعض دانشوروں کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ سوشلزم کی آمد آمد سے گھبرا کر ان رجعت پسند عناصر نے یہ لسانی ہنگامے شروع کئے ہیں تاکہ سوشلزم کے پروگرام کو سبوتاژ کیا جا سکے یہ امر مسلّمہ ہے کہ سوشلزم کے نفاذ کے لئے آئندہ مظلوم طبقوں، ہاری، مزدور اور دوسرے محنت کش عوام کا تعاون بہت ضروری ہو گا اور اس تعاون اور اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے لسانی جھگڑا ایک عمدہ ہتھیار ہے۔ یہ مذموم مقصد مذہب کے نام پر حاصل کیا جائے یا زبان اور کلچر کے نام پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا مطلب یہ ہے کہ اقتصادی ڈھانچہ جوں کا توں قائم رہے اور عوام کے لئے مصائب کی اندھیری رات کبھی ختم نہ ہو۔

سب سے زیادہ قابل توجہ بات ہے کہ اردو کے حامی وہی لوگ ہیں جو سوشلزم کے سخت مخالف ہیں کاش اردو کے حامی رہنما ترقی پسند ہوتے اور ان کے پاس عوامی پروگرام بھی ہوتا ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ عوامی رہنما بھی اس مسئلہ پر کھل کر اظہار خیال کریں جو جی ایم سید کی جارحانہ نیشلزم کو صوبہ کے لئے خطرناک سمجھتے ہیں ایک اور بڑا المیہ یہ ہے کہ سندھ میں پیپلز پارٹی کے بعض منتخب ارکان بھی کھل کر جی ایم سید کے موقف کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس سے وہ سستی شہرت تو حاصل کر سکتے ہیں، لیکن یہ لوگ سوشلزم کے پروگرام کو لے ڈوبیں گے۔

جناب بھٹو اور میر رسول بخش صاحب تالپور نے اس سلسلے میں بڑا محتاط انداز اختیار کیا ہے لیکن بعض لوگوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ صرف سندھی ہی سندھ کی زبان ہو سکتی ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ اس صوبہ میں (بشمول کراچی) سندھی داں حضرات ۵۰ فیصدی ہیں تو جمہوری طریقہ یہ ہے کہ دونوں زبانوں کو مساوی حیثیت دی جائے۔ کراچی میں بھی یونیورسٹی اور دیگر تعلیمی و سرکاری اداروں میں دونوں کو سرکاری اور تعلیمی زبان بنایا جائے اور اس طرح باقی صوبہ میں بھی اس کی پیروی کر کے جمہوری اور عوامی محاذ کو مضبوط بنایا جائے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہ ہو گا کہ چونکہ سندھ اسمبلی میں سندھی بھائی اکثریت سے منتخب ہو گئے ہیں اس لئے اب صوبے کی پچاس فیصد غیر سندھی آبادی کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے گا۔ کیا سندھی اور اردو دونوں زبانوں کو سرکاری زبان بنا دینے سے کوئی عظیم نقصان ہو جائے گا۔؟ ایسا ہرگز نہیں ہے

یہ عجیب بات ہے کہ اس سازش میں محکمہ تعلیمات سندھ یونیورسٹی اور سندھ کی نوکرشاہی بھی ملوث ہے۔ اسی طرح کراچی یونیورسٹی میں تنہا اردو کو سرکاری زبان بنا کر شیخ الجامعہ نے پورے سندھ کے لئے اردو کو نقصان پہنچایا ہے۔ جب انتخاب ہوئے تھے تو پیپلز پارٹی کو محض معاشی پروگرام کی بنیاد پر مہاجر، پنجابی، پٹھان سندھی سب ہی نے ووٹ دیئے تھے۔ یہ کہنا کہ سندھیوں کا اکثریت میں الیکشن جیتنا اس امر کے لئے کافی ہے کہ اب سندھی کے علاوہ کسی اور زبان کو علاقائی زبان نہ مانا جائے اور دیس نکالا دے دیا جائے صحیح نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں اگر ریفرنڈم کرایا جائے تو فیصلہ سندھی اور اردو دونوں کے حق میں آئے گا یہی جمہوری طریق کار ہے۔

صرف نواب مظفر حسین کی بات نہیں ہے۔ ہماری نوکرشاہی نے عجلت میں صرف سندھی کو رائج کرنے کا فیصلہ کر کے ان رجعت پسند عناصر کو خواہ مخواہ لیڈر بننے کا موقع فراہم کیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں محض اکثریتی بنیاد پر اسمبلی سے پورے ملک کی قومی زبان ہندی کو بنوا دیا۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا کہ بعد میں جگہ جگہ لسانی فسادات پھوٹ پڑے۔ جب سوئٹزرلینڈ میں ۵ زبانیں یکجا ہو سکتی ہیں، سوویت یونین میں ۱۸ زبانیں ہو سکتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ پاکستان کے ایک صوبے میں اس کی ۵۰ فیصد اکثریت کو اس کے جمہوری حق سے محروم کر کے ایک مستقل تنازعہ کی بنیاد ڈالی جائے۔

میں خاص طور سے ان لوگوں سے اپیل کرتا ہوں جو اس ملک میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور استحصال کا خاتمہ کر کے ایک سوشلسٹ معیشت کا قیام چاہتے ہیں وہ اس نکتہ کو سمجھیں اور اسے بے سبب طول دے کر سستی مقبولیت حاصل کرنے کی دوڑ میں شریک نہ ہوں۔ میں نیشنل عوامی پارٹی کے سید باقر علی شاہ صاحب سے خاص طور سے کہوں گا کہ وہ اس قسم کے بیانات دینے سے احتراز کریں کہ سندھ میں سندھی کے علاوہ کسی دوسری زبان کے علاقائی زبان بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ واضح رہے کہ سندھ ایسا صوبہ ہے جہاں اردو بولنے والے کوئی معمولی اقلیت میں نہیں ہیں۔ بلکہ تقریباً ۵۰ فیصد ہیں۔ بنگال کی ۷ کروڑ کی آبادی میں صرف ۱۰ - ۱۵ لاکھ اردو داں حضرات سے اس کا مقابلہ کرنا حقیقت پسندی نہیں ہے۔ جی ایم سید صاحب بہت خوش ہوں گے کہ انہوں نے اپنے کارندوں کے ذریعہ الیکشن میں شکست کھانے کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور آنے والے وقت میں اس حربے سے وہ پیپلز پارٹی کے لئے شدید مشکلات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اس کے علاوہ کچھ اور مسائل بھی ان کے ذہن میں ہیں۔ مثلاً پانی کا مسئلہ بھی جلد ہی منافرت پھیلانے کے لئے نئے انداز میں پیش کیا جانے والا ہے۔ کیا میرے ہموطن اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

نجم الدین قریشی

صدر بازار - حیدرآباد - سندھ

یہاں "آمریت مردہ باد" کہنا جرم ہے
ایک فرد کی سزا پورے گاؤں کو ملتی ہے

میں پاکستان کے غیور اور باشعور عوام کی توجہ گلگت اور بلتستان میں ڈھائے جانے والے مظالم کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں

نو ماہ قبل ریاست نگر کے مظلوم عوام میر آف نگر کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر گلگت انتظامیہ کو اپنے مطالبات پیش کرنے کے لئے ایک پُرامن جلوس کی شکل میں گلگت آ رہے تھے کہ راستے میں چھلت کے مقام پر گلگت اسکاؤٹس کی سربراہی میں مظلوم عوام پر گولیاں برسائی گئیں جس کے نتیجے میں ریاست نگر کے ۱۰۱ افراد شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نگر کے ۲۶ رہنما جن میں مقتدر علمائے کرام بھی شامل ہیں بغیر کسی جرم کے گرفتار کر کے جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے جو تاہنوز چیلاس جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔

عوام کے دل و دماغ سے اس المیہ کے نقوش ابھی مٹنے بھی



نہیں پائے تھے کہ ایسا ہی ایک سانحہ گلگت میں پیش آیا جس میں ناردرن اسکاؤٹس کے ذریعے فائرنگ کروا کر دو محب وطن شہریوں کو ہلاک اور درجنوں کو زخمی کر دیا گیا۔ ان واقعات کے مرکزی کردار گلگت اسکاؤٹس کے ایک اعلیٰ افسر اور ان کی بیگم ادا کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب افسر موصوف کی صاحبزادیاں امتحان میں فیل ہو گئی تھیں جس پر وہ اور ان کی بیگم پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی ہیڈ مسٹرس پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ان لڑکیوں کو کیوں فیل کر دیا گیا ہے اسی "جرم" میں ہیڈ مسٹرس کو معطل کر دیا گیا تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ صاحب نے تو "حقِ دوستی" ادا کر دیا۔ لیکن شاید ان کو معلوم یہ نہیں تھا کہ یہ وہ بہادر قوم ہے کہ جس نے ڈوگروں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ اور ۲۴ گھنٹے میں وادی گلگت سے انہیں نکال باہر کیا تھا۔

گلگت میں خرابیٔ حالات کی تمام تر ذمہ داری گلگت انتظامیہ پر عائد ہوتی ہے جس کا سربراہ ریذیڈنٹ ہے وہ صرف انتظامیہ کا سربراہ ہی نہیں بلکہ عدلیہ اور محکمہ پولیس کا بھی سربراہ ہوتا ہے۔ اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی بجائے امن و امان بحال کرنے کے لئے معمولی سی بات پر عوام پر گولیاں برسا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں جانتا اس کا ثبوت ہمیں گلگت و نگر کی حالیہ فائرنگ سے ملتا ہے۔ اگر بنیادی انسانی حقوق حاصل کرنے کے لئے آواز اٹھانا جرم ہے تو میرے خیال میں پاکستان کے ۱۳ کروڑ عوام بھی مجرم ہوں گے جنہوں نے ایوب خاں کے آمرانہ دور میں کیا کچھ نہیں کیا اور اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ عوام دورِ آمریت سے نکل کر جمہوریت کی آزاد فضائیں سانس لینے لگے ہیں۔ مگر اس کے برعکس گلگت و بلتستان میں "آمریت مردہ باد" بھی کہنا جرم ہے۔ اور اس جرم میں پولیٹیکل ایجنٹ گلگت نے فروری ۱۹۷۰ء کو ریاست نگر کے ایک بوسے گاؤں پر دس ہزار کا جرمانہ عائد کیا ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ آمریت مردہ باد کا نعرہ چند پرائمری سکول کے لڑکوں نے لگایا مگر جرمانہ پورے گاؤں پر عائد کیا گیا

افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات ہوئے مگر گلگت اور بلتستان بشمول ہنزہ و نگر کے ۷ لاکھ عوام کو ووٹ کے حق سے بھی محروم رکھا گیا۔ آخر وہ وقت بھی آیا کہ یہاں کے بہادر عوام اُٹھ کھڑے ہوئے اور جیل کی آہنی دیواروں کو توڑ کر اپنے بے قصور ساتھیوں کو باہر لانے میں کامیاب ہو گئے۔

آخر میں، میں صدر پاکستان جناب آغا محمد یحییٰ خاں اور جناب ذوالفقار علی بھٹو سے پر زور اپیل کرتا ہوں کہ گلگت و نگر کی حالیہ فائرنگ کی تحقیقات سپریم کورٹ کے ایک جج کے زیر نگرانی کرائی جائے۔ اور ذمہ دار حکام کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں۔ ریاست نگر کے ۲۶ سیاسی و مذہبی رہنما اور تنظیم ملت گلگت کے چھ کارکن اور محاذ رائے شماری کے لیڈر جناب امان اللہ صاحب کو جلد از جلد غیر مشروط طور پر رہا کیا جائے اور گلگت سے ایف سی آر جیسے رسوائے زمانہ قوانین کو ختم کر کے جمہوریت بحال کی جائے۔

(ایم۔ ڈی۔ خاں کراچی)

ہریجن طلبا سے ناروا سلوک

ہوسٹل میں بچے اپنا کھانا خود پکاتے ہیں

میں ہائی اسکول چھاچھرو، ضلع تھرپارکر میں ہریجن طلبا کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں یہ خط لکھ رہا ہوں یہ وہ طبقہ ہے جو ہاریوں پر مشتمل ہے اور جسے "نیچ" سمجھا جاتا ہے ہائی سکول چھاچھرو کئی سال سے ڈسٹرکٹ کونسل تھرپارکر کے ماتحت جاری ہے اس اسکول کا ہریجن ہوسٹل، پانچ کمروں کی ایک عمارت ہے جس کا ہر کمرہ شکستہ ہے اور برسات میں کھلے صحن میں بیٹھنا، ان کمروں میں بیٹھنے سے زیادہ محفوظ ہوتا ہے برسوں سے نہ مرمت ہوئی ہے اور نہ کوئی نیا ہاسٹل تعمیر ہوا ہے اور یہ زیادتی محض اس لئے ہے۔ کہ یہاں انتہائی نادار طبقے کے طلبا رہتے ہیں۔ تھرپارکر کی آبادی میں ہریجن ۵۰ فی صد ہیں۔ اس میں بھیل کولھی اور میگھواڑ بھی شامل ہیں اس طبقے کا افلاس ناقابل بیان ہے، ان کے بچے کوئی چھ سات سال سے اسی خراب حال عمارت میں رہتے ہیں حالانکہ دوسرے ہوسٹل اور خود سکول کی عمارت کی تعمیر، اس عرصے میں دوبارہ ہو چکی ہے۔

اب آیئے دوسرے مسائل کی طرف ہریجن ہوسٹل میں اگرچہ یہاں کے ۲۰ فی صد طلبہ رہتے ہیں، لیکن ڈسٹرکٹ کونسل کی طرف سے ہوسٹل میں کوئی باورچی ملازم نہیں رکھا گیا دوسرے ہوسٹلوں میں مسلمانوں، ٹھاکروں اور بنیوں کے لئے الگ الگ باورچی مقرر ہیں۔ خواہ طلبا کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہو۔ پھر بھی وہ باورچی ہریجنوں کا کھانا پکانے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں نتیجہ یہ کہ یہاں کے چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو اپنے ہاتھ سے خود کھانا پکانا پڑتا ہے، اس مشکل مصروفیت کی بنا پر ان کا بہت سا قیمتی وقت، جو لکھنے پڑھنے میں کام آتا، ضائع ہو جاتا ہے۔

یہ ساری بے توجہی اس لئے برتی جاتی ہے کہ یہاں کے آسودہ حال اور مقتدر طبقوں کو ہریجنوں کا تعلیم حاصل کرنا منظور نہیں معلوم نہیں علم کے دروازے نادار بچوں پر کب تک بند رہیں گے۔

مس۔ سانگی۔ چھاچھرو

کلیم الحسن نقوی پرنٹر، انیس ہاشمی پبلشر انجمن پریس میں چھپا کر دفتر لیل و نہار عظمت منزل ۱۳۷ سنٹرل کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع ہوا۔

سر درد؟

"اسپرو" کا درد کو
دُور کرنے والا طاقتور
اثر تیزی سے آپ کے
سر درد تک پہنچکر
جلد سے جلد آرام
پہنچاتا ہے۔



خاص اثر والی "اسپرو" کھائیے
جلد صحتیاب ہو جائیے"

پی آئی اے
آر سی ڈی ممالک کے
دارالخلافوں کو قریب سے قریب تر کر رہی ہے







اسلام آباد   تہران   انقرہ

ایک نئی براہِ راست اور تیز رفتار پرواز

پی آئی اے کی پرواز اب اسلام آباد - تہران اور انقرہ کے درمیان ہر جمعہ کو روانہ ہوا کرے گی۔ مشرق میں پی آئی اے کی اس تیز رفتار پرواز کے ذریعہ پہلی بار ڈھاکہ کو اسلام آباد سے براہ راست ملایا جارہا ہے - اور مغرب میں ایمسٹرڈم تک فضائی سروس میں توسیع کی جارہی ہے۔

جہاں سے یورپ کے تمام ممالک کے لئے فضائی سروس بہ آسانی فراہم ہوسکتی ہے۔

پی آئی اے کے سفر کے دوران آپ ہماری مہمان نوازی - خاطر تواضع اور اخلاق کا روایتی انداز پائیں گے۔



مزید تفصیلات کیلئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا کسی پی آئی اے آفس سے رجوع فرمائیں۔

PIA پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز

IAL - 199 - 4A/70

Lailo Nahaar Newsweekly Registered as a Newspaper with the Post Office in United Kingdom.